مؤسس: حضرت مولانا محمد اشرف خان سلیمانیؒ

سہ ماہی   پشاور

البیان

جلد:۰۴، شمارہ:۰۱   محرم الحرام، صفر المظفر، ربیع الاول ۱۴۴۶ھ

مدیر مسؤول
محمد طفیل کوہاٹی

مدیر منتظم
محمد شعیب خان

ناظم ترسیل
کبیر خان اورکزئی

مجلس تحریر
ڈاکٹر حسیب احمد خان، سلمان خان، ڈاکٹر فہد انوار، مولانا صفی اللہ

برائے رابطہ: ندوۃ التحقیق الاسلامی بہادر کوٹ کوہاٹ۔ ۰۳۳۳-۹۶۴۹۴۶۷
Tufailqasmi78@gmail.com / muhammadmomen67@gmail.com
فی شمارہ: ۱۳۰ روپے   زر سالانہ: ۵۰۰ روپے

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۔	سیرت سیدنا امام حسینؓ کے چند درخشاں پہلو	محمد طفیل کوہاٹی	۳
۲۔	حضرت حسن بصریؒ کی حضرت علیؓ سے روایت کی تحقیق	محمد طفیل کوہاٹی	۲۹
۳۔	اہل غزہ کی حالت زار اور ہماری ذمہ داری	عمر فاروق دیروی	۳۲
۴۔	دوا کے شرعی اصول۔ احادیثِ صحاحِ ستہ کی روشنی میں	ڈاکٹر فہد انوار	۳۷
۵۔	مولانا عبد الرشید نعمانیؒ کے بعض کتب پر مفید قلمی حواشی و تعلیقات	محمد محسن کمبوہ	۴۹
۶۔	مصحفِ صنعا اور تحریفِ قرآن کا دعویٰ!	ابو الحسین آزاد	۵۵
۷۔	تجدد پسندی سے الحاد تک (ایک قصہ)	ڈاکٹر حسیب احمد خان	۵۸
۸۔	سکرین کا نشہ اور خاندانی و سماجی زندگی پر اس کے اثرات	ڈاکٹر فہیم الدین	۶۲
۹۔	سندھ کے کچھ نامور علماء	محمد فہیم سکھروی	۷۱
۱۰۔	عورت کی گواہی نصف کیوں ہے؟	محمد طفیل کوہاٹی	۷۴
۱۱۔	حضرت حاجی شیر حسن رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال	ادارہ	۷۸

سیرت سیدناامام حسینؓ کے چند درخشاں پہلو

مولانا محمد طفیل کوہاٹی

[حضرت سیدناامام حسین رضی اللہ عنہ کی سیرت طیبہ کے سیاسی وسماجی پہلوؤں پر مدیر البیان مولانا محمد طفیل کوہاٹی مدظلہ کا مسجد خبیب ڈیرہ اسماعیل خان میں تقریبا دو گھنٹے کا ایک مبسوط خطاب ہوا، جسے محمد شعیب خان نے قلم بند کیا، نظر ثانی کے بعد قارئین البیان کے لیے پیش خدمت ہے۔ادارہ]

صحابہ کرام ہمارا ایمان ہیں

میرے انتہائی واجب الاحترام مسلمان بھائیو، دوستو، بزرگو! صحابہ کرامؓ کے حوالے سے جب بھی گفتگو ہو تو ابتداءً تمہیدی طور پر دو تین باتیں عرض کرنا ضروری ہوتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ ہمارا ایمان ہیں، حضرات اہل بیت اطہار ہمارا ایمان ہیں۔ انسان ہمیشہ اپنے ایمان اور عقیدے کو قرآن اور سنت کے نصوص کے تناظر میں دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ تاریخی روایات یا تاریخی قصوں اور کہانیوں کی بنیاد پر ایمان کو دیکھا جاتا ہے نہ پرکھا جاتا ہے۔ عقیدہ تاریخ کی بنیاد پر نہیں بنتا بلکہ قرآن وسنت کے قطعی نصوص کی بنیاد پر بنتا ہے۔ جن لوگوں کا پورا مذہب تاریخی واقعات کی بنیاد پر کھڑا ہو ظاہر ہے وہ مذہب نہیں بلکہ رطب ویابس کا کھوکھلا مجموعہ ہو گا۔ قرآن اور سنت صحابہ کرامؓ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ حضرات صحابہ کرامؓ کے کیا مناقب ہیں؟ اہل بیت اطہار کے کیا مناقب ہیں؟ ان کی روشنی میں ہم نے صحابہ واہل بیت کے بارے میں اپنا عقیدہ اور نظریہ بنانا ہے، چاہے تاریخ کچھ بھی کہے، ہمیں اس حوالے سے تاریخ سے کوئی سروکار ہی نہیں رکھنا۔

عہد فتنہ میں مدح صحابہ کا وجوب

دوسری چیز یہ ہے کہ جب معاشرے کے اندر خدانخواستہ صحابہ کرامؓ کے حق میں کوتاہی ہونے لگے جیسے آج کل عام ہے تو اس وقت صحابہ کرامؓ کی مدح، ان کا تذکرہ، ان کی شان، ان کے مناقب بیان کرنا اور اس کے لیے مجالس سجانا واجب ہو جاتا ہے اور امتی پر صحابہ کی معرفت واجب ہو جاتی ہے کیونکہ اگر صحابہ کرامؓ کے مقام، ان کی عظمت اور شان کی درست اور حقیقی معرفت نہ ہو تو ہمارے ایمان اور عقیدہ میں خلل کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور

معاشرے میں صحابہ کے حوالے سے جاری فتنہ انگیزی سے متاثر ہونے کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں ۔

میں نویں جماعت کا طالب علم تھا تو مجھے کسی نے ایک باطل فرقے کی کتاب دی جو جنگ جمل کے بارے میں لکھی ہوئی تھی۔اس کتاب میں حضرات صحابہ کرامؓ کے بارے میں وہ زہر گھولا گیا تھا کہ جب اسے ایک چھوٹا بچہ پڑھے گا تو ضروری بات ہے کہ اس کا عقیدہ اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکے گا، خاص طور پر جب وہ خالی الذہن ہو، لیکن تبلیغی جماعت کی برکت تھی کہ اس زمانے میں ہم فضائل اعمال میں حکایات صحابہ سنتے بھی تھے اور پڑھتے بھی تھے۔ فضائل اعمال ہر مسجد میں رکھی ہوتی ہے اور تبلیغی حضرات ہر عشاء میں اس کا واقعہ سناتے ہیں تو حکایات صحابہ پڑھنے اور سننے کا اثر تھا کہ الحمد للہ اس کتاب نے میرے اوپر کوئی منفی اثر مرتب نہیں کیا اور جوں جوں میں اس کتاب کو پڑھتا رہا میرے دل میں یہ بات پیدا ہوتی گئی کہ یہ سارا جھوٹ لکھا ہوا ہے حضرات صحابہ کرامؓ ایسے لوگ نہیں ہو سکتے۔

صحابہ کرام پر جرح جائز نہیں

فتح المغیث میں علامہ سخاویؒ نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کو آپ دیکھیں کہ وہ صحابہ کرام کے بارے میں جرح کر رہا ہے تو سمجھ لیں کہ یہ زندیق ہے اس لیے کہ صحابہ کرامؓ ہم تک دین پہنچانے کے اولین راوی ہیں ۔یہ دین حضور ﷺ سے صحابہ کرامؓ لے کر آئے ہیں۔ قرآن پاک جو آج ہمارے پاس محفوظ ہے اللہ تعالیٰ نے جو اس کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا تو تکوینی طور پر اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کے وجود کو اس کا سبب بنایا، اس کو نقل کرنے والے حضرات صحابہ کرامؓ ہیں۔ معاذاللہ اگر صحابہ کرامؓ کی ذوات کے بارے میں جرح کی جائے کہ یہ لوگ عادل نہیں تھے، یہ لوگ حضور ﷺ کے بعد معاذاللہ ایمان پر قائم نہیں رہ سکے تھے تو پھر اس دین کی حفاظت کی کوئی گارنٹی(guarantee) باقی نہیں رہتی، پھر اس دین پر عمل کا کوئی ذریعہ ہی باقی نہیں رہتا کیونکہ جب پہلا راوی بگڑ گیا تو وہ جو کچھ آپ کے سامنے پیش کرے گا اپنے بگاڑ کے ساتھ پیش کرے گا، پھر اس دین کے محفوظ ہونے کی کیا گارنٹی ہے۔ صحابہ کرامؓ حضور اقدس ﷺ کی تیئس سالہ محنت کا نچوڑ ہیں۔ تیئس سالوں میں حضور ﷺ نے اپنے محنت کا جو ثمرہ حاصل کیا وہ صحابہ کرامؓ ہیں۔اب جو شخص صحابہ کرامؓ کی عظمت اوران کی شان اور مقام پر سوالیہ نشان قائم کرتا ہے تو یہ دراصل صحابہ کرامؓ کی توہین بعد میں کر رہا ہے یہ پہلے حضور ﷺ کے تیئس سالہ محنت کو داغدار کر رہا ہے کہ معاذ اللہ وہ محنت ناکام تھی۔ یہ پہلے حضور ﷺ کی محنت کو صفر سے ضرب دے رہا ہے کہ یہ محنت کسی کام کی نہیں تھی، گویا وہ اعلان کر رہا ہے کہ یہ محنت اتنی بے کار تھی کہ اس نے جو جماعت تیار کی معاذ اللہ وہ تو حضور ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے ساتھ پانچ کے علاوہ ساری مرتد ہو گئی۔ اب بتائیں کہ حضور اقدس ﷺ کی تیئس سالہ مشقت، محنت اور جدوجہد کی توہین ہے یا نہیں؟

موضوع حضرت امام حسینؓ کی شخصیت، آپ کے کارنامے اور شہادت ہے۔ ان شاء اللہ گفتگو اسی دائرے میں کریں گے۔

اہل بیت اطہار کی زندگی: اسوۂ حسنہ

حضور اقدس ﷺ نے بعض روایات میں یہ اشارہ دیا ہے کہ اس امت کے لیے حضرات اہل بیت کا اسوہ مشعل راہ ہو گا۔ جس طرح حضور اقدس ﷺ نے ہمارے اوپر خلفائے راشدین کے سنت کی اتباع کو لازم کیا ہے اسی طرح فرمایا: کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں بعض روایات میں ہے "کتاب اللہ و سنتی" اور بعض میں ہے "کتاب اللہ و عترتی" کہ اللہ کی کتاب اور اہل بیت اطہار۔ اب امت کے ذمہ لازم ہے کہ وہ دیکھے کہ اہل بیت کی زندگی اور اسوہ میں ہمارے لیے کیا رہنمائی ہے؟ میں صرف سیاسی حوالے سے حضرات اہل بیت اطہار کے اسوہ اور ان کی زندگی سے جو رہنمائی ہمیں مل سکتی ہے وہ پانچ چھ نکات میں بیان کر کے حضرت حسینؓ کی سیرت کی طرف آتا ہوں۔

۱۔ حضرات اہل بیت اطہار کی سیرت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب امت کسی سیاسی مسئلے میں ایک سیادت پر مجتمع ہو جائے، اجماع کر لے، اتفاق کر لے، تو کسی ایسے موقع پر حضرات اہل بیت اطہار نے کبھی بھی فریق بن کر امت کو نہیں توڑا۔ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت پہ اجماع ہوا تو حضرات اہل بیت بیعت کرنے والوں میں شامل تھے، حضرات اہل بیت وزراء میں تھے، حضرات اہل بیت مشیروں میں تھے، حضرات اہل بیت اس امت کے ساتھ اس مسئلے میں جڑے رہے، انہوں نے علیحدہ تشخص، علیحدہ سیاسی شناخت، علیحدہ سیاسی حیثیت، امت کے سیاسی عصبیت کی بنیاد پر کوئی گروہ کھڑا نہیں کیا۔ لہٰذا جو لوگ امت کے مجمع علیہ سیاسی setup میں اپنا علیحدہ سیاسی تشخص پیدا کرتے ہیں، ایک علیحدہ سیاسی شناخت پیدا کرتے ہیں اور امت میں ہمیشہ سیاسی حوالے سے ایسی ٹانگ اڑاتے ہیں کہ وہ اپنے وجود سے یہ احساس دلائیں کہ ہم ایک الگ شناخت رکھتے ہیں تو یہ لوگ کبھی بھی اہل بیت اطہار کے پیروکار نہیں ہو سکتے۔

۲۔ حضرات اہل بیت اطہار نے جب یہ دیکھا کہ امت میں سیاسی انتشار پیدا ہو گیا ہے اور اس وقت امت کو سیاسی وحدت کی ضرورت ہے اور اس وحدت کے لیے جو شخص میدان عمل میں قدم رکھے گا وہ پہاڑوں جیسا بوجھ سر پر اٹھانے والا ہو گا۔ تو اس قربانی کے لیے کسی اور کی طرف دیکھنے کی بجائے حضرات اہل بیت نے خود کو پیش کیا ہے۔ اس دین کو سنبھالنے، اس میں وحدت پیدا کرنے اور سیاسی انتشار کا خاتمہ کرنے کے لیے انہوں نے یہ جرعہ زہر آب خود پیا ہے اور بااَمر مجبوری امر خلافت کو اپنے ہاتھوں میں لیا ہے۔ جیسے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کیا کہ جب حضرت عثمانؓ کی شہادت جو باغیوں اور بلوائیوں کے ایک زبردست حملے اور احتجاج

کے نتیجے میں ہوئی اور امت کے ایک بہت وسیع علاقے چوالیس لاکھ مربع میل کی سلطنت میں ایک سیاسی انتشار پیدا ہو گیا اگرچہ ابتداءً یہ انتشار صرف مصر میں تھا اور مصر کے لوگ آئے تھے لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت پر اگر کوئی معتبر شخصیت آگے نہ بڑھتی ، اولین مہاجرین میں سے کوئی شخصیت اس بوجھ کو نہ لیتی اور امت کو دوبارہ سلک وحدت میں جوڑنے کی کوشش نہ کرتی اور جو بغاوت پیدا ہو گئی تھی ان باغیوں کی راہیں بند نہ کرتیں اور ان کو اپنے حلقے میں محدود نہ کرتیں اور ان کو آزاد چھوڑ دیتی تو آج مصر تھا، کل ایران ہوتا، پرسوں شام ہوتا پھر عراق اور حجاز ہوتا یوں بغاوتوں کا یہ دروازہ ہی کھل جاتا۔ اس موقع پر اہل بیت اطہار کا اسوہ یہ ہے کہ چاہے جو بھی ہو، جتنی بھی مشکلات ہوں، جتنے مصائب آئیں، اس کے لیے آگے بڑھا جائے اور امت کے شیرازے کو بکھرنے سے بچایا جائے اور اس وقت یہ کام حضرت علی المرتضیٰؓ نے کیا، ورنہ بعض اوقات حضرت علیؓ خود فرمایا کرتے تھے، تواریخ میں ہے کہ وہ حضرت حسنؓ سے فرمایا کرتے تھے کہ کاش آپ کا باپ اس بوجھ کو اپنے سر پہ نہ اٹھاتا، لیکن باَمر مجبوری حضرات اہل بیت اطہار نے امت کی شیرازے کو بکھرنے نہیں دیا اور جو باغی تھے ان کو اپنی سیاسی بصیرت سے ایک ایسے دائرے کے اندر لے آئے کہ دوبارہ پھر امت کے اندر اس طرح کا گروہ کسی خلیفہ کے خلاف نہیں اٹھ سکا۔ یہ اہل بیت اطہار کے اسوہ سے ہمیں دوسرا سبق ملتا ہے۔

۳۔ جب حضرات اہل بیت اطہار دیکھتے ہیں کہ امت مسلمہ کی سیاسی عصبیت یا سیاسی قوت امن کی طرف جا رہی ہے اور اس امن کی قیمت ہمارے حق کی قربانی ہے کہ ہم اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں اور اپنا حق چھوڑ دیں اور اگر ہم اپنے حق پہ اصرار کرتے رہے تو امت دوبارہ کشت و خون کی طرف واپس ہو سکتی ہے تو اس موقع پر حضرات اہل بیت اطہار کا اسوہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنا حق چھوڑا ہے وہ اپنے حق سے دستبردار ہوئے ہیں وہ مصالحت کی طرف آئے ہیں تا کہ امت میں امن قائم رہے اور امت دوبارہ کشت و خون کی طرف نہ جائے۔ یہ اسوہ حضرت حسنؓ کی سیرت سے ملتا ہے کہ جب حضرت حسنؓ نے دیکھا کہ امت میں جمل و صفین کی خون ریزیوں کے بعد جو ایک خاموشی طاری ہو رہی تھی وہ دوبارہ کشت خون کی طرف جا رہی ہے اور کچھ عناصر دوبارہ جنگیں بھڑکانا چاہتے ہیں تو حضرت حسنؓ نے اپنا حق خلافت چھوڑ دیا اور اس سے دستبردار ہو گئے۔ اس نے خلافت حضرت امیر معاویہؓ کے ہاتھ میں دے دی، باوجود اس کے کہ معاشرہ ملامت کرتا رہا۔ حضرت حسنؓ پہ تنقید ہوئی، عراقیوں نے برملا تنقید کی بلکہ عراقیوں نے حضرت حسنؓ پر حملہ کیا، اسے زخمی اور مجروح کیا کہ آپ اپنے حق سے دست بردار کیوں ہوئے؟ لیکن اہل بیت اطہار وہ اتنے اللہ کی محبت میں مٹے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ اس وقت امت کے مفاد کو دیکھتے ہیں وہ ذاتی وجاہت کو نہیں دیکھتے، وہ ذاتی حیثیت کو نہیں دیکھتے، وہ ذاتی حق پہ امت کے امن اور مفاد کے لیے نہیں ڈٹتے وہ اسے چھوڑ دیتے ہیں اور اس سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔

۴۔ چوتھا سبق یہ ہے کہ اگر حضرات اہل بیت اطہار محسوس کرتے ہیں کہ محدود سطح پر ہی سہی !خلافت ' علیٰ منہاج النبوہ' کے قیام کا مقصد پورا ہو سکتا ہے اور امت میں سیاسی حوالے سے ایک ایسی ملوکیت یا گمراہ کن حکومت کا راستہ ہموار ہو رہا ہے جو آگے جا کر جبر، ظلم، لوگوں کے استحصال اور ان کے حقوق کے استیصال کا باعث بن سکتی ہے۔ اب اگر اس کی مقاومت اور مقابلے میں اتنی سیاسی قوت میسر ہے کہ محدود سطح پر سہی لیکن خلافت 'علیٰ منہاج النبوہ' کا احیاء ہو سکتا ہے تو اس کے لیے حضرات اہل بیت اطہار آگے بڑھے ہیں کسی کی مخالفت اور تنقید کی پروا کیے بغیر اس اہم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے جدوجہد کی ہے کہ صحابہ کرام کے ذریعے جو دین نافذ ہوا اور جو ایک سلسلہ خلافت کا چلا اگر اس کی بقاء اور احیاء دوبارہ ہو سکتی ہے تو کوئی بھی قربانی ہو وہ قربانی دے دی جائے لیکن اس چیز کا احیاء کر لیا جائے تا کہ دین میں ایک سنت مردہ نہ ہو جائے، وہ سنت مٹ نہ جائے، اس سنت کے احیاء کے لیے اگر جان جاتی ہے، آبرو پر حرف آتا ہے، تنقید سہنی پڑتی ہے سب کچھ سہا جائے، برداشت کیا جائے لیکن اس خلافت 'علیٰ منہاج النبوہ' کا احیاء کیا جائے۔ یہ اسوہ ہمیں حضرت حسین کی سیرت سے ملتا ہے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یزیدی اقتدار جو جبر سے استحکام چاہ رہا تھا، یزید جابرانہ طریقے سے صحابہ کرامؓ کی بیعت لینا چاہتا تھا اور وہ صحابہ کرامؓ کو مجبور کر کے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا اور یزید کی یہ جو جبر و ظلم کی حکومت جو قائم ہو رہی تھی اور وہ اپنے گورنروں کو لکھ رہا تھا کہ صحابہ کرامؓ کو بلائیں اور ان سے میرے لیے بیعت لیں اور بیعت لینے میں ان پر زبردستی کریں اور ان کو کسی طرح نہ چھوڑیں یہاں تک کہ وہ میری بیعت کرنے پر قائل ہو جائیں۔ جب حضرت حسینؓ نے یزید کا یہ رویہ دیکھا اور جب عراق کے اندر انہیں اس وقت کی موجودہ اطلاعات کے مطابق یہ محسوس ہوا کہ یہاں خلافت 'علیٰ منہاج النبوہ' قائم کی جاسکتی ہے تو وہ اس کے لیے بڑھے اور قربانی دی اور اس کے لیے انہوں نے اپنی وہ سنت اور وہ اسوہ پیش کیا جو امت کے لیے مشعل راہ ہے اور امت کے لیے اس میں سیکھنے کے بڑے اسباق ہیں۔

۵۔ اگلا سبق ہمیں یہ ملتا ہے کہ جب حضرات اہل بیت اطہار یہ محسوس کرتے ہیں کہ امت کے اندر اب سیاسی وقار کو قائم رکھنے کے ذرائع اور اسباب میسر نہیں ہے اور اب اگر اس سیاسی بالادستی کے لیے کوشش کی جائے تو ایک نیا فتنہ جنم لیتا ہے یا امت میں کشت و خون کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تو اس وقت اہل بیت اطہار کا طرز عمل اور اسوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ معاشرتی سطح پہ آکر درس و تدریس، علم تزکیہ اور عام دینی رہنمائی کے ذریعے معاشرے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ جب سیاست سے کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوتا تو وہ کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور امت کے اندر اپنی علمی اور روحانی وجاہت کے ذریعے اپنے اصلاح و ارشاد کا ایک کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ اسوہ ہمیں حضرت زین العابدینؒ سے ملتا ہے کہ کربلا کے بعد جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اب اس جابرانہ

حکومت کے خلاف عسکری جدوجہد ثمرہ آور نہیں ہو سکتی تو انہوں نے دوسرا رخ اختیار کرکے معاشرے کے عام طبقات کی رہنمائی کے لیے درس وتدریس کے ذریعے، روحانی رہنمائی کے ذریعے اور تزکیہ کے ذریعے امت کے اندر اپنا کردار ادا کیا اور اس طرح امت کے اندر دینی رہنمائی کے فریضے کو زندہ رکھا۔ یہ حضرات اہل بیت اطہار کے اسوہ سے ہمیں ایک اور سبق ملتا ہے۔

اگر ہم حضرت علی المرتضی کرم اللہ وجہہ سے لے کر جناب زین العابدین رحمہ اللہ تک اہل بیت کے عمل وکردار کا یہ روشن اسوہ دیکھ لیں تو دینی تحریکات اور دینی جدوجہد سے وابستہ حضرات کو معاشرے میں کام کرنے کا ایک پورا خاکہ میسر آتا ہے کہ کس موقع پر کیا اقدام کرنا چاہیے؟ کس موقع پر کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے؟ کون سا موقع مصالحت کا ہے اور کون سا موقع موافقت کا ہے، کون سا موقع اتفاق اور ڈٹنے کا ہے، کون سا موقع تنقید کا ہے، کون سا موقع جہاد کا ہے، کون سا موقع آگے بڑھ کر خلافت کو ہاتھ میں لینے کا ہے اور کون سا موقع اس سیاسی خلفشار سے کنارہ کش ہو کر معاشرے کے اندر اپنا دینی کردار اصلاح وارشاد تک محدود کرنے کا ہے۔ ہمیں حضرات اہل بیت اطہار کی زندگی سے پورا نقشہ سمجھ میں آتا ہے۔ اگر آج کی دینی تحریکیں حضرات اہل بیت اطہار کا یہ نقشہ اپنے سامنے رکھیں تو حضور اقدس ﷺ کے اس فرمان مبارک کا منشاء پورا ہو جاتا ہے کہ میرے بعد میری عترت کو مضبوطی سے تھام لیں اور ان شاءاللہ ہماری دینی تحریکیں، ہماری جدوجہد اور ہماری کوششیں اہل بیت کے نقش قدم پر چل کر ثمرہ آور بھی ہو سکتی ہیں اور کامیابی سے بہرہ ور اور نتیجہ خیز بھی، جیسے حضرات اہل بیت اطہار کی کوششیں الحمدللہ ہر موقع پر ثمر آور ہوئیں۔

سیدنا حضرت حسینؓ کی زندگی کا پہلا دور

حضرت حسینؓ کی زندگی کے مختلف ادوار ہیں۔ چار ہجری حضرت حسینؓ کی پیدائش ہے، حضور اقدس ﷺ کے سامنے آپؓ کا بچپن گزرا ہے۔ بچپن میں بچوں کے جتنے حقوق ہو سکتے ہیں، بچوں کے ساتھ پیار اور محبت کے جتنے مظاہر ہو سکتے ہیں، بچوں کی تعلیم وتربیت کی جو جہات ہو سکتی ہیں نیز بچوں کی سماجی حیثیت کیا ہونی چاہیے اور ان کو سماجی سطح پر کیسے treat کیا جائے۔ خاندان میں، گھر میں بچوں کی تعلیم ونگہداشت، کھیل کود، دلچسپی اور ہنسی مذاق کے کیا حدود ہونے چاہیں؟ اگر آپ احادیث کا تتبع کریں گے تو یہ پورا ذخیرہ حضور اقدس ﷺ کا حضرات حسنینؓ کے ساتھ تعامل سے مستنبط ہو سکتا ہے۔

۱۔ حضور ﷺ نے حضرات حسنینؓ کے ساتھ کھیل کود میں کیا مظاہرہ فرمایا حتی کہ کھیلتے کھودتے اگر وہ نماز کے اندر حضور ﷺ کی کمر مبارک پر چڑھ جاتے تھے تو حضور اقدس ﷺ پیار وشفقت سے اٹھا لیتے تھے۔ اگر کھیلتے کودتے مسجد کے اندر چھلانگیں لگاتے ہوئے آتے تھے اور گرتے تو حضور ﷺ ممبر سے اتر کر ان کو

اٹھا لیتے تھے۔ کندھے پر بٹھاتے، بوسہ دیتے، سینے سے لگاتے، پیار کرتے، سواری پر ساتھ سوار کرتے تاکہ بچوں کے ساتھ تعامل کا ایک عملی نمونہ امت کے سامنے پیش ہو۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کے مجمعوں میں عملی تعلیم دینے کے واسطے تکوینی طور پر دو بچے حضرات حسنین حضور ﷺ کو دیے اور حضور ﷺ نے ان سے پیار، محبت اور شفقت کے جو مظاہر چھوڑے وہ بچوں کے ساتھ محبت، شفقت، پیار، توجہ، ان کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے ہماری پوری رہنمائی کرتے ہیں۔

۲۔ بچوں کی نفسیات کا کیسے خیال رکھا جائے؟ ایک دفعہ حضور اقدس ﷺ گھر تشریف لائے اور پانی طلب فرمایا: جب پانی آنحضرت ﷺ نے اپنے دست مبارک میں لیا تو حضرت حسنؓ اور حسینؓ دونوں پانی پینے کے لیے دوڑتے ہوئے آئے لیکن پانی پہلے حضرت حسینؓ نے مانگا تو حضور ﷺ نے پانی حضرت حسینؓ کو دیا، اماں فاطمہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! معلوم ہوتا ہے کہ حسینؓ سے آپ کو بڑی محبت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں! محبت مجھے حسنؓ سے بھی ہے لیکن پانی پہلے حسینؓ نے طلب کیا۔ یہ دیکھیں! بچوں کی نفسیات کا خیال رکھنا ہے، اگر ایک بچہ دوسرے سے آگے بڑھ کر ایک چیز مانگے اور اس کو آپ مسترد کر دیں تو اس سے بچے میں احساس کمتری پیدا ہوتی ہے کہ آپ اس پر دوسرے کو بلاوجہ ترجیح دے رہے ہیں، کوئی وجہ نہیں کیونکہ اس نے تو پانی پہلے مانگا نہیں، وہ پہلے دوڑ کے پہنچا نہیں، جو دوڑ کے پہنچا اور جس نے پہلے مانگا تو حق تو اسی کا بنتا ہے، اب اس کو مسترد کر دینا یہ اس کے اندر احساس کمتری پیدا کرتا ہے۔

۳۔ اسی طرح حضور اقدس ﷺ نے ایک دفعہ عام مجمع میں حضرت حسنؓ کو بوسہ دیا، اس پر اقرع بن حابسؓ ہنسنے لگے کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرے تو دس بیٹے ہیں لیکن میں نے تو ایک کا بھی کبھی بوسہ نہیں لیا وہ قبائلی شخصیت تھے اور قبائل کے اندر لوگوں کے مزاج میں ذرا درشتی ہوتی ہیں، وہ بچوں کو زیادہ لاڈ و پیار دینا بھی مضر سمجھتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ دل کی سختی کی علامت ہے۔ بچوں کے ساتھ محبت کرنا یہ تو دل کی نرمی ہے اور جس بچے کو اپنے والدین کی طرف سے توجہ ملے، پیار ملے، نفسیاتی حوالے سے وہ بچہ باقی بچوں سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے اور وہ اپنے اندر خود اعتمادی محسوس کرتا ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے یہ نفسیات عملاً صحابہ کرامؓ کو سمجھائی کہ بچوں کو توجہ دینی چاہیے۔

۴۔ حضور اقدس ﷺ حضرات حسنینؓ کو اذکار سکھاتے تھے، ان پر معوذتین اور حفاظتی دعائیں پڑھ کر دم فرمایا کرتے تھے، ان کے لیے تعویذ لکھا کرتے تھے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ بچوں کی تعلیم و تعلم، ان کی روحانی و جسمانی حفاظت کا سنت نبوی میں اچھا خاصا اہتمام ہے، جو حضرات حسنینؓ کے ساتھ نبوی تعامل سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

یہ تھا حضرات حسنین کا پہلا دور جن سے ہم اپنے گھروں کے اندر اپنے بچوں کے حوالے سے ایک پورا نظام اخذ کر سکتے ہیں۔ اس دور میں حضرات حسنینؓ مدنی معاشرے میں جنتی شہزادوں کے مثل نظر آتے ہیں، بچپن ہی میں انہیں سید اشباب اہل الجنۃ اور حسین منی و انا منہ کا اعزاز ملتا ہے، اور امت کے لیے ان کی دینی و مقتدائی حیثیت متعین کر دی جاتی ہے، قرآن مجید کی آیت تطہیر کا آپ کو مصداق بنایا گیا جس سے آپ کی روحانی و جسمانی وفکری پاکدامنی پر نص صریح قائم ہو گئی، اس عمر میں ان دونوں بچوں کو دربار نبوی سے اتنی توجہ ملتی ہے کہ آپ کے ارشادات و تعلیمات کا ایک حصہ ان ننھے دماغوں میں محفوظ ہو جاتا ہے، جسے بڑے ہو کر امت کے سامنے روایت کیا جاتا ہے، پھر نبوی گود میں جس تربیت کا بیج لگتا ہے وہ مستقبل میں اسی جڑ پر قائم ہو کر وہ برگ وبار لاتا ہے کہ ہر دو حضرات کی حضور ﷺ کے ساتھ صرف صوری مشابہت ہی نہیں بلکہ معنوی و روحانی مشابہت بھی اتحاد ذاتی کا پورا مظہر پیش کرتی ہے۔ بہر حال حضرات حسنین کریمینؓ کے ساتھ نبوی تعامل کی احادیث بہت زیادہ ہیں اور طویل بھی ہیں اور یہ ایک مستقل موضوع ہے کہ حضرات حسنینؓ کے ساتھ تعامل کے تناظر میں بچوں کے حوالے سے ہمیں سیرت النبی سے کیا اسوہ و نمونہ ملتا ہے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی حیات طیبہ کا دوسرا دور

حضرات حسنینؓ کی زندگی کا دوسرا عہد خلفائے راشدین ہے۔ حضرت حسینؓ کی عمر حضور اقدس ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے وقت سات سال تھی۔

عہد صدیقی میں:

ا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا جو زمانہ پایا دو سال کا تو گویا حضرت صدیق اکبرؓ جب دنیا سے جا رہے تھے تو حضرت حسینؓ کی عمر مبارک تقریباً نو سال تھی لیکن اس بچپنے میں بھی حضرت ابو بکر صدیقؓ حضور اقدس ﷺ کی خلافت اور نیابت میں حضرات حسنینؓ کو مکمل توجہ دیا کرتے تھے، ان سے ہنسی مذاق کرنا، انہیں توجہ دینا، راستے میں ملے تو ان کا حال احوال پوچھنا، حضرت علیؓ کے ساتھ ہوں تو حضرات حسنینؓ کو مستقل توجہ دینا، دیکھیں! بعض اوقات جب ہم ملتے ہیں باپ کے ساتھ بچہ ہوتا ہے ہم باپ سے تو حال احوال کر لیتے ہیں لیکن بچے کو نظر انداز کر لیتے ہیں، بڑی شخصیت کو کبھی بچے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، اگر کوئی اہم بات نہ بھی ہو تب بھی کوئی دلچسپی کی بات کر لینی چاہیے، جیسے ایک بار حضرت ابو بکر صدیقؓ راستے میں حضرت علیؓ کے ساتھ جا رہے تھے، راستے میں ان کا گزر حضرت حسنؓ پر ہوا تو حضرت ابو بکرؓ نے انہیں فطرت محبت میں کندھے پر اٹھا لیا اور فرمایا: حسن تو علی سے زیادہ میرے آقا حضور اقدسؐ کے مشابہ ہیں، اس پر حضرت علیؓ ہنستے رہے۔ دیکھو!

اہل بیت کو ایک خلیفہ وقت کتنی توجہ دے رہے ہیں، یہی حضرات حسنین ؓ کا عالی مقام تھا جس کو صحابہ کرام نے قائم رکھا۔

۲۔ حیرہ سے حضرت خالد بن ولید ؓ نے مال غنیمت میں ایک عمدہ کپڑا بھیجا ، اسے تلیسان کہا جاتا تھا، یمن کا بڑا مشہور کپڑا تھا اور اس کی بڑی عمدہ چادریں آئیں، ان میں دو سب سے قیمتی چادریں حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے حضرات حسنین ؓ کے لیے منتخب فرمائیں، ایک حضرت حسن ؓ کو عطا فرمائی اور ایک چادر حضرت حسین ؓ کو عطا فرمائی، عمریں مبارک نو دس سال ہیں لیکن حضرات اہل بیت اطہار کا حضرات صحابہ کرام ؓ کے دلوں میں جو مقام تھا، جو عزت تھی، ان کی جو عظمت اور فضیلت ان کے دل و دماغ میں تھی، یہ اس کا تقاضا تھا، انہوں نے اپنے اسوہ سے ہمیں سمجھایا کہ جب بھی ایسا اہم موقع ہو کہ سرکاری خزانے سے کوئی چیز تقسیم ہو رہی ہے تو اس کے اولین حقدار خاندان نبوت ہے، ان کی حیثیت کا اعتراف کیا جائے گا۔ حضور اقدس ﷺ کے ساتھ ان کی جو مبارک نسبت ہے اس نسبت کی لاج رکھی جائے گی۔ حضور ﷺ کی نسبت کی لاج رکھنا حضور ﷺ کی امتی پر فرض ہے اور حضور ﷺ کے ساتھ محبت کا بنیادی تقاضہ ہے جو اسوہ صدیقی سے سمجھ میں آرہا ہے۔

عہد فاروقی میں:

اس کے بعد حضرت عمر فاروق ؓ کا دور آتا ہے، حضرت عمر فاروق ؓ کے دس سال سے کچھ زیادہ دور خلافت میں ان حضرات حسنین ؓ کی عمریں مبارک انیس بیس سال تک پہنچیں لیکن حضرت عمر ؓ نے ان حضرات کو اتنی توجہ دی کہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں حضرت عمر ؓ ان کو وہ اعزاز دیا کرتے تھے اور وہ مقام دیا کرتے تھے جو بڑے بڑے صحابہ کرام ؓ کا ہوتا تھا۔

ا۔ آپ کے آغاز خلافت میں ایک بار مال غنیمت سے آپ نے صحابہ کی اولادوں کو کپڑے تقسیم کیے لیکن حضرات حسنین ؓ کے شایان شان کوئی لباس نظر نہیں آیا، تب آپ نے والی یمن کو پیغام بھیجا کہ گلشن نبوت کے ان شہزادوں کے لیے مستقل پوشاک تیار کر کے بھیجی جائے لہذا آپ کے فرمان پر ان کے شایان شان لباس تیار کر کے مدینہ منورہ بھیجا گیا۔

۲۔ ایک دفعہ حضرت عمر ؓ نے حضرت حسین ؓ سے فرمایا کہ حسین !میرے پاس آنا جانا رکھا کرو، حضرت عمر ؓ بعض صحابہ کے علاوہ کسی کو اپنی مجلس میں زیادہ وقت نہیں دیتے تھے ،نو عمروں میں یہ استثناء ایک تو حضرت عبد اللہ بن عباس ؓ کی تھی کہ کم عمری کے باوجود انہیں حضرت عمر ؓ کا قرب ملا تھا اور اس کی وجہ وہ یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ حضور اقدس ﷺ نے ابن عباس ؓ کے لیے قرآن فہمی کی دعا کی تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالی نے ان پر قرآن مجید کے معارف ودقائق کھول دیئے تھے، لہذا ان کو بڑے صحابہ کے ساتھ رائے میں شریک کرتے

تھے۔ حضرت عمرؓ کا حضرت حسینؓ کو یہ کہنا کہ "میرے پاس آیا کریں" اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو حضرت حسینؓ میں ذہانت ، فہم وفراست اور بصیرت کے وہ جوہر دکھائی دے رہے تھے جن سے فراست عمری کام لینا چاہتی تھی، اس لیے وہ ان کو اپنا قرب خاص عطا فرما رہے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ ہی کی خواہش پر حضرت حسینؓ تشریف لے آئے، راستے میں دروازے کے قریب انہیں حضرت عبداللہ بن عمرؓ ملے جو واپس آ رہے تھے، حضرت حسینؓ کی ان کے ساتھ علیک سلیک ہوئی اور فرمایا کہ کہاں سے آ رہے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ابا حضور کے ہاں سے آ رہا ہوں اور شام سے حضرت معاویہؓ تشریف لائے ہوئے ہیں اور کوئی ضروری اجلاس اور میٹنگ ہے اور وہ دو کے دو تنہا ہیں ، کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں مل رہی اور مجھے بھی دروازے سے واپس کر دیا گیا ہے۔ حضرت حسینؓ نے یہ سمجھا کہ جب حضرت عبداللہ بن عمر کو اجازت نہیں ملی تو مجھے کیسے مل سکتی ہے؟ دوسری طرف حضرت معاویہؓ شام جیسے بڑے صوبے کے گورنر ہیں ، کوئی اہم سیاسی مشورہ ہو گا جو اس کے لیے خلوت کی مجلس مقرر کی گئی ہے، کوئی ایسا خفیہ سیاسی ایشو ہو گا جس کے لیے حضرت عمر نے اپنے گھر میں بیٹے کو اندر آنے نہیں دیا تو لازمی بات ہے مجھے نہیں جانا چاہیے۔ یہ حضرت حسینؓ کا فہم تھا، ان کی بصیرت تھی کہ وہ وہیں سے واپس چلے گئے، یہ بڑوں کا لحاظ ہوتا ہے۔ ہمارے یہ جو نوجوان بیٹھے ہیں اس سے سبق سیکھیں، کسی کو استاد توجہ دے دیتا ہے تو پھر منہ اٹھا کے ہر وقت استاد کے کمرے میں بھی گھس رہا ہے، استاد کی خلوت گاہ میں بھی براجمان ہے، کیونکہ دو دن توجہ جو مل گئی حضرت کو تو وہ خود حضرت بن بیٹھتا ہے۔ چند دن بعد حضرت عمرؓ نے اتفاقاً پوچھا کہ حسین! میں نے آپ سے آنے کا کہا تھا اور آپ آتے نہیں؟ حضرت حسینؓ نے کہا: امیر المؤمنین !میں تو چند دن پہلے آیا تھا لیکن راستے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ملاقات ہوئی، وہ واپس آ رہے تھے، میں نے سمجھا کہ آپ کی ضروری مجلس ہے اور جب ان کو اجازت نہیں ملی تو مجھے بھی واپس ہونا چاہیے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے بڑی عجیب بات ارشاد فرمائی کہ حسین! کیا تو نے خود کو ابن عمر کے برابر سمجھ لیا، اذن کی ضرورت ابن عمر کو ہے، عمر کے گھر میں، عمر کی سیاسی مشاورت اور میٹنگ میں اجازت کی ضرورت تیرے لیے نہیں ہے۔ سوچیے! حضرت عمرؓ نے حضرت حسینؓ کو کیا مقام بخشا؟ اور اس وقت کہ حضرت حسینؓ کی عمر مبارک چودہ پندرہ سال ہے، اتنا اونچا مقام دے رہے ہیں کہ ایک حکومتی خصوصی میٹنگ میں اس کو اجازت ہے کہ کسی قسم کی روک ٹوک کے بغیر آپ کسی بھی وقت آ سکتے ہیں۔ اس سے ایک تو یہ اندازہ ہوا کہ حضرات حسنینؓ کی تعلیم تربیت اس طرز پر ہوئی تھی کہ ان میں امتیازی نفسیات نہ تھی وہ خود کو عام لوگوں کے مساوی سمجھتے تھے۔ دوسرا یہ معلوم ہوا کہ خلافت عمری میں ان کی فہم ودانش اور سیاسی شعور میں اتنی پختگی پیدا ہو گئی تھی کہ حضرت عمرؓ جیسی زیرک وباریک بین شخصیت کو ایک اہم سیاسی میٹنگ کے درمیان بھی ان کا آنا جانا ناگوار نہیں تھا، تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی اعتبار سے جو اہم فیصلے ہوا کرتے تھے جنہیں دوسروں سے چھپانا مقصود ہوتا تھا وہ حضرات اہل بیت اطہار سے پوشیدہ نہیں رکھے جاتے تھے، یا وہ ایسے نہیں تھے کہ حضرات اہل بیت اطہار کی شرکت وہاں پر ناگوار سمجھی جاتی، یعنی ان کو یہ مقام حضرت عمرؓ کے دور میں حاصل تھا اور جب یہ مقام حاصل تھا تو ظاہر ہے کہ اس سطح پر ان کی شمولیت بھی ہوگی، اسی سطح پر ان کی سرگرمی بھی ہوگی، اسی سطح پر ان کی کاوشیں بھی ہوں گی۔

۳۔اب اس عمر میں حضرات حسنینؓ کی تعلیم و تربیت تو جاری تھی لیکن کیا عملی سیاسی سرگرمیوں میں ان کی شرکت تھی یا نہیں؟ حضرت عمرؓ کے زمانے تک جب ان کی عمریں اٹھارہ انیس سال ہیں، اہل سنت کی کتب میں کوئی ایسی صریح روایت دستیاب نہیں ہوتی کہ ان حضرات کو کوئی سیاسی مشن یا ذمہ داری بھی سپرد ہوئی ہو۔ اہل تشیع کی کتابوں میں اس کا حوالہ ملتا ہے کہ عہد عمری میں عراق کا جو جہاد ہو رہا تھا اس میں حضرت حسنؓ بھی شریک ہوئے ہیں تو اس وقت جو خلافت کی توسیع ہو رہی تھی اور تمکین دین کے لیے جو جدوجہد ہو رہی تھی، اس میں بروایت اہل تشیع حضرات حسنینؓ کا حصہ حضرت عمرؓ کے زمانے سے پڑنا شروع ہو چکا تھا۔

عہد عثمانی میں:

اس کے بعد دور آتا ہے حضرت عثمانؓ کا، حضرت عثمانؓ کے زمانے میں حضرات حسنین کی عمریں بھی بڑی ہو گئی تھیں اور اب باقاعدہ انہوں نے امت کے ملی، سیاسی، جہادی اور خلافتی سرگرمیوں میں براہ راست حصہ لینا بھی شروع کر لیا تھا۔

ہمارے ہاں حضرات حسنینؓ بالخصوص حضرت حسینؓ کی سیرت بیان کرتے وقت ایک کوتاہی برتی جاتی ہے کہ ایک تو بچپن بیان ہو جاتا ہے اور بچپن سے پھر ڈائریکٹ (direct) کربلا کی طرف چھلانگ لگا دی جاتی ہے، درمیان کا جو عرصہ ہے، اس پر مکمل خاموشی اختیار کی جاتی ہے اور ایک بڑا عجیب المیہ یہ ہے کہ مؤرخین کے ہاں بھی اس عہد میں ایک خاموشی دکھائی دیتی ہے، بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ کربلا کا حادثہ اتنا بڑا تھا اور اس حادثے کے واقعات اتنے پھیل گئے کہ وہ واقعہ ہی ان کی پوری سیرت پہ غالب آ گیا اور سیرت کے باقی پہلو یا تو کم ذکر کیے گئے یا ذکر ہی نہیں کیے گئے، یا جب کم ذکر کیے گئے تو اختصار کے ساتھ انہیں گزار دیا گیا۔

ا۔لیکن بہر حال حضرت عثمانؓ کے زمانے میں سیاسی اور جہادی سرگرمیوں اور خلافت کی توسیعات میں حضرات حسنین کا باقاعدہ حصہ تھا۔ دور عثمانی کے بڑے مہمات میں ایک افریقہ کا جہاد ہے، والی مصر حضرت عبداللہ بن ابی سرحؓ نے حضرت عثمانؓ سے اجازت چاہی کہ وہ افریقہ پر حملہ کرنا چاہتے ہے، مرکز کی طرف سے انہیں اجازت ملی، عموماً جو والی جس مہم کی اجازت طلب کرتا، اس کے لیے فوج اسے ہی مہیا کرنا ہوتی، مدینہ منورہ

یعنی مرکز خلافت سے خاص افراد ہی مہیا کیا جاتے جو ایک طرح کے ذیلی کمانڈر ہوتے تھے، اس جہاد میں طرابلس فتح ہوا، یہ لیبیا کا شہر ہے، موجودہ نام ٹریپولی ہے، مدینہ منورہ سے اس کا فاصلہ تقریباً تین ہزار چار سو نو کلومیٹر بنتا ہے، الغرض اس عظیم مہم کے لیے مدینہ منورہ سے جو خاص دستہ روانہ کیا گیا اس میں سر فہرست حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما تھے، یہ چھبیس ہجری کا معرکہ ہے، اس وقت میں حضرت حسینؓ بائیس سال کی عمر میں مدینہ سے تین ہزار چار سو نو کلومیٹر کا سفر طے کر کے غزوہ طرابلس لڑنے گئے ہیں، سبحان اللہ! بائیس سال اتنا طویل سفر طے کرتا ہے، لڑتا ہے، مجاہدات برداشت کرتا ہے، والد سے دور، مدینہ طیبہ سے دور، اور کون؟ کوئی عام نوجوان نہیں، حضور اقدس ﷺ کا نواسہ، حضرت فاطمہ زہراؓ کے آنگن کا پھول، حضرت علیؓ کا جگر گوشہ، افریقہ کے صحراؤں میں جہاد کرنے کے لیے جارہا ہے، گویا حضرت عثمانؓ کے زمانے میں باقاعدہ حضرات حسنین نے ملی، قومی اور سیاسی امور میں عنفوان شباب ہی سے ذمہ داریاں اٹھانا شروع کر دی تھیں اور اسلامی حکومت کی توسیع و استحکام کے لیے اپنی خدمات ایسے ہی پیش کیں، جس طرح دیگر اکابر صحابہ پیش فرما رہے تھے۔

۲۔ اس کے بعد جو دوسرا بڑا جہاد جو ہوا وہ خراسان کے مختلف علاقوں کی مہم تھی۔ اس زمانے کا خراسان افغانستان کے صوبہ ہرات، بادغیس، بامیان اور ہمارے بلوچستان کا خضدار وغیرہ یہ علاقہ اور ایران کے کچھ علاقے یہ پوری خراسانی سلطنت تھی جو اب گم ہو گئی ہے، خراسان تین ملکوں کے اندر بکھر گیا ہے۔ تیس ہجری میں کوفہ کے والی سعید بن العاصؓ نے ان علاقوں پر حملہ کا ارادہ کیا، مرکز سے اجازت ملنے پر جن سر کردہ شخصیات کو مدینہ منورہ سے روانہ کیا گیا، ان میں حضرت حسینؓ کا نام نامی سر فہرست ہے، اس وقت آپ کی عمر مبارک چھبیس ستائیس سال تھی، خراسان کا یہ سفر جو کہ مدینہ سے عراق اور پھر ایران کے راستے سے ہوا، ڈھائی ہزار کلومیٹر بنتا ہے۔ یہ سفر طے کر کے حضرت حسینؓ نے حضرت سعید بن ابی العاص الامویؓ کی قیادت میں یہ جنگ لڑی ہے اور اس میں بھی مردانہ وار لڑے ہیں، خراسان کو فتح کیا، پھر جوزجان میں داخل ہوئے جو موجودہ ایران کا مشہور شہر ہے، اسی طرح طبرستان کو فتح کیا ہے، ان تین علاقوں میں تیس ہجری کے جو غزوات ہوئے ہیں ان سب میں حضرات حسنینؓ دونوں شریک رہے ہیں اور میدان جنگ میں ایک جانباز جرنیل کا کردار ادا کیا ہے۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت کی اہم سیاسی و ملی امور میں گلشن نبوت کے ان دونوں شہزادوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اس وقت کے سیاسی امور میں اہم کام دو ہی تھے کہ یا تو مرکز کے اندر رہ کر شوریٰ کے ذریعے تمام ملکی شعبوں کو اپنی بہترین آراء، تجاویز کے ذریعے استحکام بخشا جائے یا عدالت و

قضا کے اعتبار سے ملک کو مضبوط کیا جائے، یہ کام مرکز میں بیٹھ کر حضرت علیؓ کر رہے تھے، آپؓ خلفائے ثلاثہ کے زمانے میں مرکز کے اندر ایک وزیر کی حیثیت سے، ایک مضبوط مشیر کی حیثیت سے، ایک زبردست قاضی کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیتے رہے اور شوریٰ کے تمام امور میں فیصلہ کن حیثیت سے شامل رہے۔ خلفائے ثلاثہ کی خلافتیں جو انتہائی کامیابی کے ساتھ چلی ہیں اور ان میں جو مسلسل توسیعات ہوئی ہیں۔ اس میں جہاں خلفائے ثلاثہ کی اپنی عظمت، فہم اور بصیرت شامل تھی، وہیں اس میں حضرت علیؓ کی مشاورت اور وزارت کا بھی برابر کردار رہا ہے اور انہوں نے پورے اخلاص اور کاوش کے ساتھ ان خلافتوں کی توسیع اور استحکام میں اپنا کردار ادا کیا۔ الغرض ایک طرف مرکز میں حضرت علیؓ بیٹھے ہیں، تو دوسری طرف مدینہ منورہ سے ہزاروں کلومیٹر دوران کے دونوں صاحبزادے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان جنگ کے اندر لڑ کر خلافت کے استحکام کے لیے کوشش کر رہے ہیں اور اموی سرداروں اور جرنیلوں کی قیادت میں لڑ رہے ہیں۔ دیکھیں! حضرات اہل بیت اطہار فضیلیت میں اموی سرداروں سے بدرجہا اونچے تھے، چاہے حضرت عبداللہ بن ابی سرحؓ ہوں، یا حضرت سعید بن ابی عاص امویؓ، حضرات حسنینؓ کا مقام ان سے بہت بالا ہے، لیکن اس کے باوجود امت اور خلافت کے استحکام کے لیے انہوں نے ان کی قیادت قبول کر کے اپنا فرض ادا کیا ہے، وہ مدینہ میں نہیں بیٹھے کہ ہمیں تو وظیفہ مل رہا ہے، ہم یہاں مسجد نبوی کے اندر اپنی مجلس تعلیم وتربیت قائم کر سکتے ہیں، معاشرے میں اصلاح کا کام کر سکتے ہیں بلکہ اس کڑیل جوانی میں انہوں نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر اپنے عظیم والد کی دوری برداشت کر کے عام صحابہ کے صاحبزادوں اور نوجوانوں کی طرح صف اول میں جا کے صحابہ کی قیادت میں یہ جنگیں لڑی ہیں۔

۳۔ حضرت عثمانؓ کے ساتھ حضرت حسین اور حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں کی بڑی قرابت تھی، حضرت عثمانؓ حضرات حسنین کو اپنے نجی اسفار تک میں شریک رکھتے تھے۔ حضرت عثمانؓ ایک بار عمرے کے ارادہ سے عازم سفر ہوئے، چوالیس لاکھ مربع میل کا حکمران جب سفر کرتا ہے تو خلافت کے سرکاری امور بھی ہوں گے، اس سفر میں آپ نے جن دو رفقاء کو منتخب کیا وہ حضرت عبد اللہ بن جعفر اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں شہزادگان اہل بیت تھے، جب خلیفہ وقت کا یہ قافلہ مقامِ سقیا پہ پہنچا تو حضرت حسینؓ کو شدید بخار ہو گیا، اس وقت حضرت حسینؓ کی عمر تیئس سال تھی، تیئس سال کی عمر میں خلیفہ وقت کی طرف سے سفر کے لیے جس رفیق کا انتخاب کیا جاتا ہے تو لازمی بات ہے ان رفقاء کی کچھ سیاسی بصیرت بھی ہو گی، اس بصیرت پر خلیفہ کا اعتماد بھی ہو گا، ورنہ کوئی حکمران جس کی ہمہ وقت سیاسی مصروفیات ہوتی ہیں، امور مملکت پر بات چیت اس کی ہر مجلس کا حصہ ہوتی ہے، کیا اپنے سفر میں کسی کو بھی ساتھ لے جا سکتا ہے، مجھے یا آپ کو کوئی

لے کر جاسکتا ہے؟ حکمران ان لوگوں کو منتخب کریں گے سیاسی اعتبار سے جن کو قابل اعتماد سمجھتے ہیں، ملکی وملی امور کے رازوں میں ان کی شرکت گوارا کرتے ہیں ۔حضرت حسینؓ شدید بیمار ہو گئے، تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ سفر منسوخ کرتے ہیں، احرام بھی باندھا ہوا ہے، فرمایا: میں حسین کو اس حالت میں چھوڑ کر آگے نہیں جاسکتا۔ حضرت حسینؓ نے قسم دی کہ امیر المومنین! آپ احرام نہیں کھولیں گے، آپ جاکر عمرہ ادا کریں، قسم دینے کے بعد حضرت عثمانؓ نے اس شہزادے کے قسم کی لاج رکھی، پہلا بندوبست یہ کیا کہ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کو ان کی تیمارداری کے لیے چھوڑا، دوسرا بندوبست ان کے ساتھ حفاظت کے لیے دستہ چھوڑا، تیسرا بندوبست وہاں سے تیز ترین سواریاں منتخب کرکے مدینہ حضرت علیؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ فی الفور یہاں پہنچیں، ان انتظامات کے بعد حضرت عثمانؓ آگے چلے، عجلت میں عمرہ کیا اور اپنا یہ سفر انتہائی مختصر کرکے فوراً واپس پہنچ گئے، جب پہنچے تو حضرت حسینؓ وہیں تھے، حضرت علیؓ پہنچ چکے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ سے معذرت کی اور کہا کہ میں معذرت کرتا ہوں کہ میں حسینؓ کے پاس نہ ٹھہر سکا لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت حسینؓ نے مجھے قسم دی کہ آپ نے یہ سفر منسوخ نہیں کرنا ظاہر ہے سفر میں کوئی اہم امور ہوں گے، پھر حضرت عثمان احرام میں بھی تھے، اس لیے حضرت حسینؓ نے محض اپنی خاطر خلیفہ وقت کو زحمت دینا مناسب نہ سمجھی، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جانور منگوایا، ذبح کروایا اور حضرت حسینؓ احرام سے حلال ہوئے اور پھر یہ قافلہ ایک ساتھ مدینہ واپس ہوا۔

اس سے اندازہ کریں کہ حضرات حسنینؓ ملی ملکی اور قومی امور یہاں تک کہ نجی اسفار تک حکمرانوں کے ساتھ شریک رہے، بائیس، تیئیس کی عمروں میں سیاسی عمل کے اندر بھی ان سے کوئی سیاسی راز نہیں رکھا گیا، ان سے کسی سیاسی سفر یا سیاسی مشاورت کو خفیہ نہیں رکھا گیا بلکہ ان کو ساتھ رکھا گیا تو جن کو ساتھ رکھا جارہا ہے ظاہر ہے وہ سارے پالیسیوں سے بھی باخبر ہوں گے، وہ سارے سیاسی رازوں سے بھی باخبر ہوں گے، وہ حکومتی فیصلوں سے بھی باخبر ہوں گے، ان کو حکومت کا کلی اعتماد بھی حاصل ہو گا اس لیے ان کو ساتھ رکھا جارہا ہے۔

۴۔ حضرت عثمانؓ کے عہد ۳۱ھ میں آپ کے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر بن کریزؓ نے خراسان کے بادشاہ یزدجرد کو شکست دے کر ان کی دو شہزادیوں کو لونڈی بنایا اور انہیں مدینہ بھیجا، اس طرح کے بڑے اور شاہی خاندانوں کی خواتین عموماً بلند مرتبہ لوگوں کو عطا کی جاتیں، یہ دو شہزادیاں بھی گلشن نبوت کے دونوں شہزادوں حضرات حسنینؓ کو عطا کی گئیں، حضرت حسینؓ کو جو شہزادی ملی، اس کا نام شہر بانو تھا، اسی کے بطن سے آپ کے صاحبزادے حضرت علی بن حسین زین العابدینؒ پیدا ہوئے۔

۵۔ عہد عثمانی کا آخری وقت انتہائی خونچکاں تھا، جس وقت مصر سے باغیوں کی مدینہ پر یورش ہوئی، تو جن

لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا پہرہ دیا اور ہتھیار بند ہو کر باغیوں کو روکے رکھا، ان میں حضرات حسنین کریمینؓ سر فہرست تھے، باغیوں کے ساتھ مڈ بھیڑ میں حضرت حسنؓ زخمی ہوئے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ حضرات حسنینؓ کا تعلق کس نوعیت کا تھا؟

عہد علوی میں:

حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دور آیا، یہ دور اپنی ابتلاؤں اور آزمائشوں کے اعتبار سے انتہائی سخت دور تھا۔ قاتلین عثمانؓ کے مسئلہ پر باہم آراء کا اختلاف پیدا ہو گیا، خوارج کا قضیہ علیحدہ اٹھا، عبداللہ بن سبا منافق کی گہری سازشوں کے بچھائے ہوئے جالوں کی مقاومت مستقل مسئلہ تھا، آپ تاریخ کا مطالعہ کریں جن شخصیات کی بصیرت اس پورے عمل میں کھل کر سامنے آتی ہے ان میں سر فہرست حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، انہوں نے اہل شام، خوارج اور سبائیوں کے حوالے سے جو جو مشورے حضرت علیؓ کو دیے وہ آپؓ کی سیاسی بصیرت، ان کی گہری سوچ، ان کی جنگی مہارت اور ان کی دور رس نگاہ پر شاہد عدل ہیں۔ یہ بہت ہی عجیب موضوع ہے اور اس پر اگر کوئی کام کرے تو یہ ایم فل، پی ایچ ڈی سطح کا کام ہے۔ مشاجرات، خوارج اور عبداللہ بن سبا کی تحریک ان تین معاملات کو محقق اٹھائے۔ ان تینوں معاملات میں حضرت حسنؓ کی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ جو گفتگو ہے، اگر کوئی اس کا سیاسی تجزیہ کرے تو آپ اندازہ کریں گے کہ مقام اور مرتبہ تو اپنی جگہ لیکن حضرت علیؓ کے احباب میں حضرت حسنؓ سے بڑھ کر سیاسی بصیرت والی شخصیت دوسری نظر نہیں آتی ۔ اسی طرح جو جنگی معاملات ہیں خوارج کے ساتھ جنگ میں باقاعدہ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ میمنہ کی قیادت کرتے رہے، صف اول کے کمانڈروں میں تھے، اس آزمائشی دور نے آپ کو کندن بنا دیا تھا۔ ہمارے سامنے تو حضرات حسنینؓ کی سیرت یوں بیان کی جاتی ہے جیسے معاذ اللہ وہ نرم گداز بستروں پر آرام فرما شہزادے تھے۔ نہیں بھئی! وہ میدانوں میں لڑنے والے، وہ گھوڑوں کے پشت پر بیٹھ کر تلوار زنی اور نیزہ بازی کرنے والے اور صف اول کے اندر کھودنے والے لوگ تھے، وہ لڑ لڑ کے بڑے بڑے جتوں کے منہ پھیر دیتے تھے، کشتوں کے پشتے لگا دیتے تھے۔ حضرت علیؓ کے زمانے میں ان کی جو سرگرمیاں تھیں وہ تو بہت طویل موضوع ہے، اب میں قلت وقت کے پیش نظر آتا ہوں حضرت معاویہ کے دور میں کہ جب حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کی صلح ہو گئی اور حضرت معاویہؓ کی خلافت پر امت مجتمع ہو گئی اور بیعت ہو گئی تو اس کے بعد ان کی سرگرمیاں کیا تھیں؟

عہد امیر معاویہؓ میں:

اب بظاہر شاید لوگوں کے ذہن میں یہ آتا ہو کہ ایک طویل عرصہ صحابہ کرام کی باہمی رنجشیں رہیں جو

رنجشیں حضرت حسنؓ کی مصلحانہ کوششوں سے اور حضرت معاویہؓ کی بصیرت سے ختم ہوگئی تھیں اور امت ایک ہوگئی تھی، لیکن چونکہ دلوں پر اثر تو ہوتا ہے لہذا حضرات حسنینؓ نے یہ سوچا ہو کہ اب مدینہ طیبہ کے اندر بیٹھیں گے اور ہمارا اعزاز و اکرام امت کے اندر ویسے بھی موجود ہے بس ان سیاسی اور حکومتی سرگرمیوں سے کنارہ کشی بہتر ہے۔ نہیں! بلکہ جس طرح انہوں نے معاشرے کے اندر پہلے خلفاء کے زمانے میں اپنا کردار ادا کیا وہ حضرت معاویہؓ کے دور میں بھی رہا اور حضرت معاویہؓ کو اس کا اعتراف تھا، میں اس پر دو واقعات ہی ذکر کروں گا۔

ا۔ شام سے حضرت معاویہؓ نے ایک قریشی شخص کو مدینہ طیبہ بھیجا، جو اللہ والے ہوتے ہیں وہ اپنے متعلقین کو کہیں بھیجتے ہوئے انہیں بتاتے ہیں کہ وہاں فلاں بزرگ کی مجلس ہے، ان کی خدمت میں بھی جانا ہے، ان کی مجلس سے استفادہ کرنا ہے۔ یہ اللہ والوں کی روایت ہے، اب بھی یہ ہوتا ہے جب اساتذہ شاگردوں کو کہیں بھیجتے ہیں تو بتاتے ہیں کہ بھائی وہاں فلاں بڑے عالم ہیں اس سے ملنا ہے، فلاں بزرگ ہیں ان کی خدمت میں جانا ہے، حضرت معاویہؓ نے بھی اپنے متعلق شخص کی رہنمائی کی کہ جب آپ مدینہ طیبہ جائیں گے تو وہاں مسجد نبوی میں ایسی مجلس میں حاضری دینی ہے جس مجلس کے حاضرین ایسے خاموش، متوجہ اور یکسو بیٹھے ہوں گے جیسا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں اور میں دوسری علامت آپ کو صاحب مجلس کی بتاؤں کہ نصف ساق تک ان کا ازار بندھا ہو گا۔ گویا حضرت معاویہؓ نے ایک علامت صاحب مجلس بزرگ کی بتائی اور ایک علامت مجلس کی بتائی، پھر صراحت سے فرمایا کہ وہ مجلس ابو عبد اللہ حسین بن علیؓ کی ہو گی، آپ نے اس مجلس میں حاضری دینی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عہد معاویہ میں حضرات حسنینؓ معاشرے کی عام اصلاح، تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور چونکہ حضرت معاویہؓ شام میں تھے۔ سال میں ایک بار حضرات حسنینؓ کی شام جانا ہوتا رہتا تھا لیکن عموماً حضرت معاویہؓ کے ساتھ سیاسی مشاورت یا عمل میں شرکت کا موقع نہیں تھا تو ایسی صورت میں اہل اللہ کا سب اونچا منصب معاشرے کا تزکیہ، تعلیم و تربیت کے لیے مجالس کا انعقاد، مساجد کی اعمال سے آبادی یہ سلسلہ انہوں نے شروع کر دیا تھا۔ اس سے یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ عہد صحابہ میں صحابہ کی اصلاحی مجلسیں لگا کرتی تھیں اور طریق نقشبندیہ میں جو بالکل خاموش بیٹھنا ہے ایسے خاموش بیٹھنا کہ جیسے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں اور کسی کو ہوش نہ ہو۔ حضرت معاویہؓ کی شہادت اور گواہی سے حضرت حسینؓ کی مجلس کا یہ رنگ ملتا ہے اور وہ درویشانہ اور فقیرانہ حلیہ اور وضع قطع جس کی نشاندہی حضرت معاویہؓ نے فرمائی اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت حسینؓ پر اپنے نانا مکرم ﷺ اور اپنے والد ماجد کرم اللہ وجہہ کے فقر و درویشی کا کامل اثر تھا۔ حضرت حسینؓ نے معاشرے کی تربیت، تعلیم، اور تزکیہ کو عہد معاویہؓ میں بھی جاری رکھا اور اس میں سرگرم عمل رہے۔ یاد رکھیں کہ معاشرے کے اندر جب تعلیم مضبوط ہو، معاشرے

کے اندر جب تزکیہ مضبوط ہو، معاشرے کی جب روحانی تربیت ہو تو یہ خلافت کے استحکام کی بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔ خلفاء کی خلافتیں، حکومتیں یہ تب قائم رہتی ہیں جب ان میں فتنے نہ ہوں، ان میں لوگ اپنی باطن کی اصلاح کی طرف متوجہ رہیں، اپنی تعلیم وتربیت کی طرف متوجہ رہیں، تاریخ میں جتنے فتنے اٹھے ہیں ان کا شکار جو نوجوان ہوئے ہیں آپ ان کا مطالعہ کریں وہ یا تو تعلیم سے دور ہوں گے یا وہ تزکیہ سے دور ہوں گے۔ آپ کے قبائل میں جو نوجوان ایسے بے روزگار تھے وہ چڑھتے گئے لوگوں کے ہاتھوں اور استعمال ہوتے گئے۔ تعلیم وتربیت، فہم، بصیرت جن لوگوں کے پاس ہوتی تھی وہ ہمیشہ یک رخے نعروں کے پیچھے نہیں چلتے تھے، تو حضرت معاویہؓ کی خلافت کے استحکام میں حضرت حسینؓ کا اس پہلو سے بھی اثر اور حصہ ہے کہ انہوں نے معاشرے کی تعلیم، تزکیہ اور تربیت کے منصب کو سنبھالے رکھا۔

۲۔ ۴۹ھ یا ۵۱ھ میں حضرت معاویہؓ کے دور میں اہم جہادی معرکہ پیش آیا، اعلان ہوا کہ شام سے اسلامی لشکر قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاری کر رہا ہے، قیصر روم کے اس مرکز کو زیر کرنے کے لیے جانے والے اس اولین لشکر کے لیے لسان نبوت سے خاص بشارتیں منقول تھیں۔ لہذا جب حضرت معاویہؓ نے قسطنطنیہ کے جہاد کا ارادہ کیا، یہ بہت بڑا معرکہ تھا اور انتہائی ٹھنڈے علاقے کی طرف سفر تھا، صحابہ کرام اور عرب کے لوگ ٹھنڈی آب وہوا کے عادی نہیں تھے، سخت ترین جہاد تھا اور اس جہاد کا چرچا پوری خلافت میں ہوا، ہر طرف سے مجاہدین اسلام دمشق کی طرف روانہ ہونے لگے۔ اللہ اکبر! حضرت حسینؓ نے بھی مدینہ سے رخت سفر باندھا اور اس عظیم جہاد میں شرکت کے لیے شام روانہ ہو گئے اور حضرت معاویہؓ کے اس برپا کردہ جہاد میں شامل ہوئے، نا موسم کی سختی کی پروا کی، نہ محاذ جنگ کی دوری کی پروا کی، اگر کوئی ذہنی دباؤ ہوتا، دل میں اموی سرداروں کے بارے میں کوئی اثر ہوتا تو کیا خلافت کے استحکام کے لیے تعلیمی سطح پر، تزکیہ اور تربیت کی سطح پر، جہاد کی سطح پر حضرات اہل بیت اطہار اپنی یہ خدمات پیش کرتے، جب انہوں نے اپنی یہ خدمات پیش کی ہیں تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے دلوں میں حضرت امیر معاویہؓ کے حوالے سے کوئی پرکاش نہیں تھا اور ان کی حضرت امیر معاویہؓ کے ساتھ جو صلح ہو گئی تھی وہ ایسی صلح تھی کہ انہوں نے صلح میں دل ودماغ پوری طرح ایک دوسرے سے صاف کر دیے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت ومودت اور تعاون کا نہ صرف جذبہ تھا بلکہ عملی حصہ تھا۔

۳۔ عہد معاویہؓ میں حضرات حسنینؓ کے سرکاری وظائف اسی طرح جاری رہے، حضرت حسینؓ ہر سال حضرت معاویہؓ کے پاس بصورت وفد دمشق جاتے اور حضرت معاویہؓ ان کا اعزاز واکرام بجالاتے۔ خود شیعی تواریخ گواہی دیتے ہیں کہ حضرات حسنینؓ کو حضرت معاویہؓ سے ان کے عہد خلافت میں قطعاً کوئی شکایت پیدا نہ

ہوئی۔ دوسری طرف حضرات حسنینؓ کی شان تو یہ تھی کہ خلافت سے ملنے والے ان کے وظیفے جو ان کا بنیادی حق تھا، محتاجوں اور فقیروں میں بانٹ دیتے تھے۔ یہ معلوم رہے کہ اس وقت وظیفہ خزانے سے ہر فرد کو ملتا تھا، یہ وظیفہ حضرت عمرؓ کے دور سے مقرر ہو گیا تھا حتیٰ کہ دودھ پیتے بچے کا وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا۔

ایک دفعہ حضرت حسین رضی اللہ تعالی عنہ کے دروازے پر ایک سائل آیا اور کہا کہ مجھے کچھ چاہیے، میری حالت بڑی دگرگوں ہے، میری مدد کیجیے۔ حضرت حسینؓ نے اسے فرمایا کہ آپ تھوڑا صبر کریں، دمشق سے حضرت معاویہؓ کچھ بھیج رہے ہیں، قاصد کے آنے کا دن ہے اور جب پہنچ جائے گا تو میں آپ کو کچھ دوں گا۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے ایک قاصد آیا، اس نے حضرت معاویہؓ کی طرف سے پیغام دیا کہ حسین !میری معذرت قبول فرمائیں، یہ تھوڑا سا مال ہے اسے جہاں مناسب سمجھیں صرف کر دیں۔ پھر اس نے پانچ تھیلیاں دیں، ہر تھیلی میں ایک ہزار دینار تھے۔ حضرت حسینؓ نے کھولے بغیر سائل کے حوالے کر دیئے کہ خود بھی ضرورت پوری کریں اور ضرورت مندوں کو بھی دیں۔ ناصبی بدبخت اور بے غیرت یہ کہتے ہیں کہ معاذاللہ حضرات حسنینؓ حضرت معاویہؓ کے دور میں مال و دولت لے کر اور وظائف پر مزے لوٹتے رہے اور جب حضرت معاویہؓ دنیا سے چلے گئے تو معاذ اللہ وہ اس کے بیٹے کے خلاف کھڑے ہوئے۔ اب ان بدبختوں کو کوئی بتائے کہ حضرات اہل بیت کی شان تو یہ تھی کہ حضرت معاویہؓ کی طرف سے آنے والا مال کا تھیلا کھولا بھی نہیں، کھولے بغیر سائل کو دے دیا، کیا زندگی تھی ؟انہوں نے تو کبھی مال جمع ہی نہیں کیا حتی کہ اتنے وظائف کے باوجود حضرات حسنینؓ مقروض ہو جاتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کی جو جائیدادیں تھیں، ان میں کئی جائیدادیں حضرت حسینؓ نے اپنے قرضے میں فروخت کی ہیں۔ ناصبیوں کو یہ نظر نہیں آتا کہ بیت المال کے وظائف تو چھوڑیں انہوں نے تو اپنے خرچے اور اخراجات کے لیے اپنی زمینیں بیچی ہیں وہ اتنا دینے والے تھے کہ کوئی سائل ان کے دروازے سے خالی گیا ہی نہیں۔ ان کی تو یہ شان تھی کہ وظیفہ آتا تھا تو شام تک تقسیم کر دیتے تھے تو وہ اس شان کے لوگ تھے ایسے لوگوں کے بارے میں یہ جسارت کرنا بدبختی اور بے غیرتی کے سوا کیا ہے؟

ایک بار حضرت معاویہؓ کو علم ہوا کہ حضرت حسینؓ پر دو لاکھ درہم قرضہ ہو گیا، حضرت امیر معاویہؓ اہل بیت کی خودداری سے واقف تھے، وہ جانتے تھے کہ میں مدد کروں گا تو قبول نہیں فرمائیں گے، لہذا امیر معاویہؓ نے ذاتی رقم سے دو لاکھ درہم بھیجے اور فرمایا کہ اپنی فلاں زمین مجھے بیچ دیں، یہ اس کی قیمت ہے، شاید حضرت حسینؓ بھی سمجھ گئے کہ معاویہؓ اس عنوان سے میری مدد کرنا چاہتے ہیں، لہذا درہم واپس کر دیئے اور فرمایا کہ میں قرض کے لیے زمین نہیں بیچ سکتا۔ کیا خودداری تھی حضرت امام عالی مقام حسین بن علیؓ کی۔ رضی اللہ عنہم اجمعین

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی زندگی کا تیسرا دور:

اب اگلا دور حضرت معاویہؓ کے بعد آتا ہے، حضرت معاویہؓ کے دور میں سلطنت اسلامیہ چونسٹھ لاکھ پینسٹھ ہزار مربع میل تک وسیع ہو چکی تھی۔ حضرت امیر معاویہؓ اپنے بھائی یزید بن ابی سفیانؓ کی شہادت کے بعد قیادت میں آئے اور شام کے گورنر بنے، حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں فتح شام کے بعد سارا عرصہ انہوں نے گورنری کا گزارا، پھر حضرت عثمانؓ کی زمانہ خلافت کے بارہ سال بھی انہوں نے گورنر شام کا منصب سنبھالے رکھا اور مسلسل شام میں رہے، پھر حضرت علیؓ کے ساتھ جو معاملات رہے ان میں بھی وہ مسلسل شام کے اندر رہے، پھر انیس سال کم و بیش ان کی اپنی خلافت رہی اس پوری خلافت کے اندر حضرت امیر معاویہؓ شام ہی میں رہے اور شام ان کا مرکز رہا۔ یہ چالیس، پینتالیس سال کا عرصہ شام کی سرزمین پر انہوں نے گزارا ہے۔ ان پینتالیس سالوں میں شامیوں کی پوری دو تین نسلیں پروان چڑھی ہیں، جو دس دس سال کے تھے وہ پچپن پچپن سال پہ پہنچے ہیں، جو بیس بیس سال کے تھے وہ پینسٹھ پینسٹھ سال پہ پہنچے تھے، جو پیدا ہوئے تھے وہ چالیس پینتالیس سال پہ پہنچے تھے اور جو حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت میں پیدا ہوئے تھے وہ تو بیس بائیس سال کے گبرو جوان تھے تو شامیوں کی یہ دو تین نسلیں مکمل بنو امیہ کے ساتھ رہی ہیں، انہوں نے جو بیوروکریسی دیکھی بنو امیہ واہل شام کی دیکھی، قاضی دیکھے بنو امیہ واہل شام کے دیکھے، ان کے جتنے وزاراء و نگران تھے جو ان کو سرکاری خزانے سے وسائل، وظائف اور سہولیات دیتے تھے، یہ سارے لوگ بنو امیہ کے تھے، پھر شامیوں نے جن لوگوں کی قیادت میں جنگیں لڑیں، افریقہ، قبرص، خراسان اور وہ مختلف علاقے جن میں حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ کے دور میں جہاد ہوتا رہا وہ سارے جرنیل بنو امیہ کے تھے۔ اب اتنا وسیع ملک، چونسٹھ لاکھ پینسٹھ ہزار مربع میل کا جغرافیہ، جو ہمارے نو دس پاکستانوں کے برابر ریاست بنتی ہے، اس کی بیوروکریسی بنو امیہ، فوجی کمانڈر بنو امیہ، عسکری ماہرین، جنگی منصوبہ ساز، تھنک ٹینک اکثر بنو امیہ کے حضرات ہیں، کیونکہ حضرت معاویہؓ کا سارا زمانہ وہیں گزرا۔ دیگر صحابہ کی بھی خلافت میں نمائندگی ضرور تھی اور ان کے پاس کئی صوبوں گورنرشپ بھی تھی، عمومی طور پر معاشرے میں صحابہ کرام کی اہمیت و مقام بھی مسلم تھا لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ جہاں خلیفہ بیٹھا ہوتا ہے، جس مرکز سے پورے سلطنت کو کنٹرول کیا جاتا ہے، وہیں کے لوگ خلیفہ کے قریب اور سامنے ہوتے ہیں، انہی میں جو ٹیلنٹ یافتہ لوگ ہوتے ہیں ان سے کام لیا جاتا ہے، کیونکہ آج کل کی طرح ذرائع مواصلات تو تھے نہیں کہ پورے ملک کا ٹینلٹ سامنے ہو۔ اس لیے حضرت معاویہؓ نے بھی امور سلطنت پر انہیں لوگوں کو نامزد کر رکھا تھا جن کی استعدادیں اور حالات سامنے تھے اور جنہیں وہ چالیس سال سے آزما رہے تھے۔ الغرض ملک کے پورے سیاسی و انتظامی ڈھانچے میں شامی حضرات کی کارکردگی نمایاں تھی، خلافت کے

اندر ان کے عہدے تھے،وہ یہ ساراکام طویل عرصہ سے سنبھال رہے تھے،ان کا تجربہ بھی تھااور حالات سے واقفیت بھی تھی۔

استخلاف یزید کا پس منظر

اب حضرت معاویہؓ کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ ایک ریاست جو اتنے طول و عرض پر مشتمل ہو،ایک ایسے شخص کے حوالے کرنی ہے، جسے ملک کی بیوریوکریسی مانے، جسے فوجی کمانڈر بھی تسلیم کریں اور جس پر ملک کا تھنک ٹینک بھی متفق ہو، کامن سیاسی اصول یہی ہے۔ اس کے لیے حضرت معاویہؓ نے ناموں پر مشاورت کی کہ ان کے بعد بار خلافت کس نے کندھوں پر ڈالا جائے؟ قیادت کے لیے یہ مشاورتی عمل بہت طویل رہا۔ حضرت معاویہؓ نے اسے صرف شام تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس مشاورتی عمل کے لیے حضرت معاویہؓ شام سے باہر گئے وہ حجاز بالخصوص مدینہ ومکہ گئے، لہٰذا حضرت معاویہؓ اس مشاورتی عمل کے لیے ہر اہم جگہ پر اہم شخصیت کے پاس گئے تاکہ جس شخصیت کو اتنی بڑی سلطنت دی جائے اس پر اتفاق رائے پیدا ہو اور کوئی افراتفری نہ ہو، کیونکہ فوج اگر کسی کو نہیں مانتی جبکہ ساری طاقت تو فوج کے پاس ہے اگر فوج کے ہاں ایک بندہ قابل قبول نہیں ہے تو کیا وہ سیاسی نظام میں جم سکتا ہے؟ نہیں جم سکتا۔ حضرت معاویہؓ کی بصیرت سے یہ بات مخفی نہیں تھی۔ بیوروکریسی ایک بندے کو تسلیم نہیں کرتی بیوروکریسی اس کے خلاف مسائل بناتی ہے کہ نہیں بناتی؟ حکمران کا جو انتظامی سیٹ اپ ہوتا ہے، اگر اس کے ساتھ علاقائی یا مزاجی مناسبت نہیں ہوتی تو بھی نظام نہیں چلتا۔ الغرض اس مشاورتی عمل میں ایک نام یزید کا بھی آیا اور یزید کے نام پر خلافت کی شوریٰ میں اختلاف بھی ہوا۔ حضرت معاویہؓ کے جو اپنے اصحاب تھے ان میں اکثریت کی رائے یہ تھی کہ اس انتقالِ اقتدار کے لیے یزید مناسب ہے لیکن خود حضرت معاویہؓ کے اصحاب میں حضرت عمرو بن حزمؓ اور حضرت احنف بن قیسؒ جیسے جہاں دیدہ شخصیات کی رائے یہ تھی کہ یزید نہیں ہونا چاہیے ، ان حضرات نے اپنا حق رائے دہی یزید کے خلاف استعمال کیا، باقی ساری شوریٰ یزید پر متفق تھی۔ اس سے واضح ہوا کہ امیر معاویہؓ نے معاذ اللہ کوئی ایسا ٹولہ اپنے گرد نہیں بٹھایا تھا کہ جو دل کی بات ان کے سامنے زبان پر نہ لا سکتا ہو، کوئی ایسا جبر نہیں تھا، خود حضرت معاویہؓ کے اصحاب میں ان دو حضرات کا ذکر تو صراحتاً ملتا ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کی رائے سے اختلاف کیا۔ اکابر صحابہ کرامؓ میں ایک جماعت ان حضرات کی تھی جن کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ان سیاسی تقاضوں سے بالاتر ہو کر خلافت کا منصب اس شخصیت کے حوالے کرنا چاہیے جو علم، فہم، تقویٰ اور بصیرت کے اعتبار سے امت کی مسلمہ شخصیات میں سے ہو، یہ سیاسی تقاضے تو میں نے عرض کر دیئے۔ سیاسی تقاضے تو یہ ہیں کہ فوج، bureaucracy، عدلیہ، ملکی setup وہ ان کو تسلیم کرے اور اس کی شخصیت ان میں جم سکے لیکن صحابہ

کرامؓ کی ایک جماعت کا نقطہ نظر یہ تھا کہ نہیں جناب سیاسی تقاضوں سے بالاتر رہنا چاہیے، سیاسی تقاضے جو بھی ہوں، ولی عہد میں تقویٰ، علم، فہم اور بصیرت کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ظاہر بات ہے کہ حضرت حسینؓ جیسی شخصیت موجود تھی انہیں صحابیت کی شان حاصل ہے، ان کے مقابلے میں صحابی تو چھوڑیں یزید تو تابعی بھی نہیں ہے کیونکہ صحابی تو وہ ہے جو حضور اقدس ﷺ کو دیکھے یا حضور کی نگاہ مبارک اس پر پڑ جائے اور ایمان کی حالت میں ہو اور اس کو ادنیٰ اور معمولی صحبت میسر آئے لیکن تابعی میں ایک اور شرط بھی ہے کہ اسے صحابہ کا اتباع بھی نصیب ہو اور وہ صحابہ کا قاتل نہ ہو، وہ منجنیقوں سے صحابہ کرام پر بمباریاں کرنے والا اور حملہ کرنے والا نہ ہو، یزید کو تو تابعیت بھی حاصل نہیں حضرت حسینؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ یزید کا کوئی موازنہ ہی نہیں بنتا، یہ صحابہ تھے اور وہ تابعی تک نہ تھا۔ حضرت معاویہؓ کے پیش نظر استخلاف یزید کے لیے جو واحد وجہ ترجیح تھی وہ صرف یہ تھی کہ چونسٹھ لاکھ پینسٹھ ہزار کا سیاسی setup اس پر متفق رہے گا، ورنہ اتنی بڑی خلافت زیر وزبر ہو جائے گی، یہ شکست و ریخت کا شکار ہو جائے گی، بغاوتیں اٹھ جائیں گی، اب یہ ان کا اجتہاد تھا اور واقعی حالات ایسے ہی تھے شامیوں کی تین نسلیں بنو امیہ کے ساتھ جوان ہوئی تھیں، حکومت کے شعبوں پر ان کا غلبہ تھا، وہ کسی غیر اموی پر راضی نہیں ہو سکتے تھے، تو ایک سیاسی مجبوری کے تحت جس پر شوریٰ کی اکثریت بھی متفق تھی، حضرت معاویہؓ نے یزید کو منتخب کیا۔ حضرت معاویہؓ کو شاید اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ جو اکابر صحابہ اس رائے سے متفق نہیں کہیں یزید سے ان کی شان میں بے ادبی نہ ہو اسی وجہ سے انہوں نے یزید کو کچھ وصیتیں بھی کیں، ان میں اہم وصیت یہ تھی کہ حضرت حسینؓ کا اکرام اور اس کا خیال رکھنا ہے کیونکہ حضرت معاویہؓ کو بخوبی علم تھا کہ یزید کو حضرت حسینؓ کے ساتھ علم، فہم، بصیرت، تقویٰ اور شان و مرتبہ میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ حضرت معاویہؓ کے اجتہاد میں اگر یزید کا چناؤ ہو رہا تھا تو اس کی صرف ایک ہی وجہ تھی، لہٰذا حضرت معاویہؓ نے اپنے اس اجتہاد اور اکثریتی شورائی فیصلے کے تحت چونسٹھ لاکھ پینسٹھ ہزار مربع میل کے سیٹ اپ کے لیے جو شخصیت انہیں موزوں لگی ان کے لیے انہوں نے بیعت لینے کا عمل شروع کیا لیکن جن صحابہ کو اختلاف رائے تھا ان پر انہوں نے جبر نہیں کیا اور نہ ان سے زبردستی منوایا، خود اپنے اصحاب میں جو دو نام میں نے لیے، تاریخ میں ایک شہادت بھی نہیں ملتی کہ اس اختلاف رائے پر انہوں نے اپنے اصحاب کو منصب سے جدا کیا ہو تو اس سے آپ اندازہ کریں کہ معاویہؓ کا جو چناؤ تھا معاذاللہ یہ کسی سیاسی عصبیت کی بنیاد پر نہیں تھا کہ وہ اموی خاندان کو فہم میں بصیرت میں یا مرتبے میں بالاتر سمجھتے تھے ایسی کوئی بات نہیں تھی بلکہ اس وقت کے جو سیاسی تقاضے تھے ان سیاسی تقاضوں کے پیش نظر یہ بات ہو گئی۔

یزیدی حکومت کے خلاف اقدام حسینی کی وجہ:

لیکن حسین رضی اللہ عنہ کی بصیرت دیکھ رہی تھی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ کی حکومت عادلہ جس طرح سے چلی جس میں صحابہ کا ایک احترام اور اعزاز رہا، صحابہ کرام کی اہمیت رہی، صحابہ کی کفالت کے حوالے سے حضرت معاویہ ؓ کی جو حساسیت رہی اور صحابہ تک ان کے وظائف وحقوق بروقت پہنچتے رہے تاکہ وہ مالی تنگی کا شکار نہ ہو، اسی طرح حکومت عادلہ کے سارے عادلانہ اقدار قائم رہے لیکن یزیدی اقتدار میں یہ سب کچھ قائم نہیں رہ سکے گا، اس لیے حضرت حسینؓ متفکر تھے کہ اب جو شخص برسر اقتدار آچکا ہے جسے اپنی ذاتی merit پر نہیں بلکہ صرف اس وجہ سے چنا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے سلطنت کا استحکام رہے گا اور لوگ اسے تسلیم کریں گے، بیوروکریسی، فوج اور عدلیہ اور حکومتی انتظامیہ اس پہ متفق رہے گی لیکن حضرت حسینؓ کے پاس عراق سے اٹھارہ ہزار خطوط پہنچے کہ آپ ہمارے ہاں آجائیں، ہم یزیدی اقتدار کو نہیں مانتے، ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرکے خلافت علی منہاج النبوۃ کے قیام کی کوشش کرتے ہیں۔ امام عالی مقامؓ نے جب یہ دیکھا کہ عراق جیسا بڑا صوبہ اس کے لاکھوں لوگ یزید پر راضی نہیں ہیں، تو انہیں اندازہ ہوا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اجتہاد سے اور مشاورت سے جس واحد وجہ کی بنیاد پر اور جن سیاسی تقاضوں کی بنیاد پر یزید کا چناؤ کیا تھا وہ تقاضے بھی تو پورے نہیں ہو رہے، جب ایک شخص کا صحابہ کے مقابلے میں نہ علم ہے، نہ فہم ہے، نہ بصیرت ہے صرف ایک وجہ ہے کہ اس پر امت مجتمع رہ سکے اور وہ بات بھی نہیں ہو رہی۔ لہذا اب اختلاف رائے ہو گا، ان لاکھوں لوگوں کو اگر صالح قیادت نہ ملی تو خلافت علی منہاج النبوۃ کا امکان بھی ہاتھ سے جائے گا، دوسری طرف جو کشت وخون ہو گا اس میں صلحاء کی عزتیں اور جانیں محفوظ نہیں رہیں گی۔ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دوررس نگاہ دیکھ رہی تھی کہ جب یزید پر عدم اعتماد بڑھے گا تو اس ظالم نے پھر صحابہؓ کی عزتوں کو بھی تار تار کر دینا ہے اور صحابہ کا مقام اور احترام اس نے باقی ہی نہیں رکھنا، لہذا ان حالات میں اگر اس کی مقامت ہو سکتی ہے اور خلافت علیٰ منہاج النبوہ کی ایک صورت محدود سطح پر سہی! سامنے آسکتی ہے تو اس میں کوتاہی جرم ہو گی اور اس کے لیے بڑھنا حال کا امر ہے، اس کے لیے ہمت کرنی چاہیے۔

یہ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان صدیقیت تھی کہ انہوں نے اس امر کا ادراک کیا اور وہ اس کے لیے بڑھے، اگرچہ بعض صحابہ کرامؓ نے اسے روکا، لیکن جب امت میں اس طرح کے حالات آتے ہیں تو امت کے فقہاء اور علماء کی رائے میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ صحابہ کی رائے میں بھی اختلاف ہوا، صحابہ کرامؓ کے پیش نظر وہی بات تھی جو بات حضرت معاویہؓ کے پیش نظر تھی کہ اس کی بیعت کرلی جائے اور خاموش رہا جائے تو شاید امت اس پر مجتمع ہو جائے لیکن حضرت حسینؓ کی نگاہ وہ صدیق کی نگاہ تھی، یاد رکھیں! صدیق سارے

صحابہ ہیں لیکن صدیقیت کے مراتب ہیں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ صدیق اکبر تھے، ورنہ صدیق تو سارے صحابہؓ ہیں لیکن عہد صدیقی میں بھی امت پر ایسا موقع آیا کہ اس موقع کی حساسیت اور نزاکت ابو بکرؓ کے علاوہ کسی پہ نہیں کھلی، جیسے منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کا مسئلہ تھا اور اس موقع پر کسی صحابی کا شرح صدر نہیں ہو رہا تھا حتی کہ حضرت عمرؓ کا بھی شرح صدر نہیں تھا لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جب مسئلہ واضح کیا تب جا کے حضرت عمرؓ کو شرح صدر ہوا، لہذا صدیق اپنی شان صدیقیت سے جو کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے، ضروری نہیں وہ ہر شخص دیکھ لے۔ یہی شرح صدر یزید کے بارے میں اور یزید کی استحصالی حکومت کے بارے میں حضرت حسینؓ کو ہو چکا تھا۔ حضرت حسینؓ کو اسی وقت ہوا اور باقی صحابہ کو واقعہ کربلا کے بعد ہوا کیونکہ صدیق کا جو فیض ہوتا ہے اس فیض سے امت کا سینہ کھلتا ہے، جلد ہو یا بدیر ہو بہر حال امت کا شرح صدر ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے تو ایک تھپڑ سے حضرت عمرؓ کا شرح صدر ہوا اور حضرت حسینؓ نے اپنا سر کٹوایا، تو امت کو شرح صدر ہوا، حضرت حسینؓ نے اپنے سر کا نذرانہ دیا، اپنے گھرانے کے سترہ کڑیل جوانوں کا خون پیش کیا، تب جا کر ہر ایک کا شرح صدر ہوا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے پاس ایک عراقی آیا اور مچھر کے خون کا مسئلہ پوچھا تو حضرت ابن عمرؓ نے اسے کہا کہ ظالمو! مچھر کے خون کی فکر ہے اور نواسہ رسول کا خون بہایا اس خون کا احساس نہیں ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ افسوس کیا کرتے تھے کہ میں ان امویوں کے خلاف حجاج کے لوگوں کے خلاف نہ لڑ سکا، مجھے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ اور صحابہؓ کے ساتھ کھڑے ہو کر ان کے خلاف لڑنا چاہیے تھا کیونکہ بعد کے حالات نے تمام صحابہ کرامؓ کا شرح صدر کر لیا تھا اور سب نے عملاً بیعت توڑ دی تھی، اس موقع پر صحابہ کرامؓ میں سے بعض کی نگاہ وہ حضرت معاویہؓ کے فیصلے کی اس وجہ اور حکمت پر تھی لیکن حضرت حسینؓ مرتبہ صدیقیت میں چونکہ اس وقت سب سے بلند مرتبے پر تھے اور اس عہد کے صدیق اکبر تھے، انہوں نے اپنی نگاہ صدیقیت اور بصیرت سے ان حالات کا ادراک کر لیا تھا جو سالوں اور مہینوں بعد صحابہ کرامؓ کو ہونا تھا انہوں نے پہلے سے وہ سارا منظر نامہ دیکھ لیا اور اس اقدام کو انہوں نے ضروری سمجھا۔

شہادت حسینی: تکمیل سیرت النبی ﷺ

حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا باب خود حضور اقدس ﷺ کی حیات طیبہ کے ایک باب کی تکمیل ہے۔ وہ اس طرح کہ شہادت ایک بہت بڑا منصب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو انعام یافتہ طبقات قرآن پاک میں بیان فرمائے ہیں: نبیّین، صدیقین، شہداء اور صالحین ۔ انبیاء میں سب سے افضل کون؟ خاتم النبین حضرت محمد ﷺ سب سے افضل، اب افضل الانبیاء میں انعام یافتہ طبقات کی یہ چاروں خصوصیتیں ہونی چاہئیں نبوت بھی، شہادت بھی، صداقت اور صالحیت بھی ۔ اب میرے بھائیو! آپ کہیں گے کہ حضور ﷺ تو شہید

نہیں ہوئے، باقی ساری خصوصیات کے آپ جامع ہیں لیکن شہادت کی خصوصیت موجود نہیں۔

شہادت کے لیے ضروری تھا کہ آپ پر کسی کا وار چلتا اور کوئی دشمن خدا آپ کو شہید کر تا لیکن قرآن پاک کی نص قطعی ہے: 'والله يعصمک من الناس 'کسی انسان کا ہاتھ آپ پہ حاوی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ حضور اقدس ﷺ کو شہید کر دے۔ اللہ نے حضور ﷺ کی حفاظت کا غیب سے بندوبست کیا، شہید کرنے کی کوششیں ہوئیں، لیکن کامیاب نہ ہو سکیں۔ کیونکہ شہادت کا آغاز جو ہوتا ہے وہ ضرب سے ہوتا ہے، ضرب حضور ﷺ پر لگی، جنگ احد میں دندان مبارک شہید ہوئے، پتھر گرانے کی یہودیوں نے کوشش کی، تبوک کے سفر میں بارہ منافقوں نے حملہ کرنے کی کوشش کی، شہادت کی کوششیں ہوئیں، خیبر سے واپسی پر زہر دیا گیا، زہر سے شہید کرنے کی کوششیں ہوئی۔ کیونکہ شہادت دو طرح کی ہوتی ہے: ایک شہادت سری ہے اور ایک شہادت جہری ہے۔ شہادت سری حضور اقدس ﷺ نے روایات میں بیان فرمائی ہے کہ اگر کوئی بندہ ڈوب کر مر جائے یا کسی کو زہر دے کر مارا جائے تو یہ شہید ہوتا ہے اور یہ آخرت کے اعتبار سے شہید ہوتا ہے، دنیا میں اس پر شہید کے احکام جاری نہیں ہوتے، اس کو غسل بھی دیا جاتا ہے کفنایا بھی جاتا ہے اور عام مردوں کا معاملہ اس کے ساتھ ہوتا ہے اور شہادت جہری یہ ہے کہ اگر کوئی میدان جنگ کے اندر اپنا سر قربان کر دے تو اس پر شہید کے جو خاص احکام ہے وہ جاری ہوتے ہیں ۔ سری شہادت کا آغاز تو حضور ﷺ کی حیات میں ہو گیا تھا جب جنگ خیبر سے آتے ہوئے آپ کو زہر کھلایا گیا اور جہری شہادت کا آغاز طائف واحد سے ہو گیا تھا جب آپ ﷺ پر پتھر پھینکے گئے اور آپ ﷺ کے دندان مبارک شہید کیے گئے تھے، آپ کے چہرہ انور پہ وار کیا گیا تھا اور منافقین کی طرف سے آپ کو تبوک میں شہید کرنے کی کوشش کی گئی تھی یہ آغاز ہو گیا تھا لیکن تکمیل حضور ﷺ کی زندگی میں نہیں ہوئی ، کیونکہ اس تکمیل سے نص قطعی مانع تھی، اگر یہ تکمیل ہوتی تو لوگ آیت کو جھٹلاتے۔ لہذا حضور ﷺ کی زندگی میں شہادت سری اور جہری کا آغاز ہو تو گیا تھا اب تکمیل کروانی تھی، تکمیل اس پر ہونی تھی جو حضور ﷺ کے بدن کے ٹکڑے ہوں جو حضور ﷺ کے جزؤ ہوں۔

حضرت ام فضلؓ فرماتی ہے: یارسول اللہ! میں نے خواب دیکھا ہے، تیرے بدن اطہر سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹا گیا اور وہ ٹکڑا آکے میرے گود میں گر گیا، بڑا اڈراؤنا خواب تھا، میں بیان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ تو بڑا مبارک خواب ہے، فاطمہؓ کے ہاں بچہ پیدا ہو گا اور وہ بچہ تیرے گود میں آئے گا۔ حضرت حسینؓ پیدا ہوئے اور ان کی رضاعت حضرت ام فضلؓ نے حضرت قسم بن عباسؓ کے ساتھ فرمائی، یہ رضاعی بھائی ہیں اور حضرت ام فضلؓ کے گود میں پروان چڑھے اور حضور کی بشارت سچ ہوئی ۔ تو خوابوں میں دکھایا گیا کہ حضرت حسینؓ، حضور ﷺ کے بدن کے ٹکڑے ہیں اور اولاد ویسے بھی اپنے باپ کا جزؤ ہوتی ہے، اصول فقہ کے اندر علمائے کرام یہ مسئلہ بیان کرتے ہیں ۔ تو اب جو شہادت کی تکمیل کروانی تھی ظاہر ہے کہ وہ اس پر کروانی تھی جو حضور ﷺ کے بدن کا جزؤ ہو اور جزؤ دو تھے: حسن و حسین تو شہادت سری کی تکمیل حضرت حسنؓ پر کروائی گئی کہ اسے زہر دیا گیا اور ایسا شدید زہر تھا کہ انتڑیاں مبارک وہ پیشاب کے راستے سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل کر آپ شہید ہو

گئے اور شہادتیں جہری کی تکمیل وہ کربلا کے میدان میں حضرت حسینؓ پر کروائی گئی کہ اس نے اپنے سر کا نذرانہ وہاں پیش کیا۔ یہ دراصل حضور اقدس ﷺ کے سیرت کے ایک باب کی تکمیل ہوئی۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حسنؓ پیدا ہوئے تو میں نے ان نام کا حرب رکھا۔ حضور ﷺ تشریف لائے، تحنیک کے لیے۔ فرمایا: علی کیا نام رکھا ہے؟ میں نے کہا: جی! حرب۔ فرمایا: نہیں، حرب نہیں، ان کا نام حسن ہے۔ پھر کہتے ہیں: حسینؓ کی ولادت ہوئی، تو میں نے ان کا نام حرب رکھا، حضرت علیؓ جنگجو آدمی تھے، جنگی نام انہیں بڑے پسند تھے۔ کسی نے حضور ﷺ کے آباء میں سے کسی سے پوچھا کہ یہ آپ اپنے غلاموں کے بڑے اچھے اچھے نام رکھتے ہیں: نافع، مرزوق اور اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں: کلاب اور حرب اور بھیڑیوں کے نام پر اور شیروں کے نام پر اور چیتوں کے نام پر اور تلواروں کے نام پر۔ تو بچوں کے عجیب عجیب نام رکھتے ہیں جبکہ غلاموں کے بڑے عمدہ نام رکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا: غلاموں کے نام اپنے لیے رکھتے ہیں بچوں کے نام دشمنوں کے لیے رکھتے ہیں۔ حضرت علیؓ حرب نام رکھنا چاہتے تھے، حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں! یہ حسین ہے۔ حضور ﷺ نے حسن و حسین نام رکھے، ان ناموں میں حسنیٰ مشترک ہے اور لغت کی بعض کتابوں میں معنی لکھا ہوا ہے 'الحسنی ای الشہادہ' حسنیٰ شہادت ہے کیوں؟ اس لیے کہ شہادت میں بھی انجام حسنہ ہوتا، شہادت انجاموں میں سے بہترین انجام ہے کیونکہ حضور ﷺ نے اس انجام کی تمنا فرمائی کہ یا اللہ! مجھے شہادت کی موت دے پھر میں زندہ کیا جاؤں پھر تیری راہ میں مارا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں۔ تو حضور اقدس ﷺ نے گویا نام رکھ کر اشارہ دے دیا تھا کہ ان کا جو انجام حسنہ ہونے والا ہے وہ اس مرتبہ شہادت پر ہونے والا ہے جو مرتبہ منعم یافتہ لوگوں کا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمایا ہے اور جس پر میرے مرتبہ شہادت کی تکمیل ہونی ہے۔

میرے بھائیو! حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ ان تمام تکوینی حکمتوں اور تشریعی پہلوؤں کے ساتھ کوفہ کی طرف بڑھے، لیکن افسوس کہ اہل عراق نے ہمیشہ کی طرح پیٹھ دکھائی، عین موقع پر آپ کے تعاون سے مکر گئے، آپ کے چچازاد حضرت مسلم بن عقیلؓ جنہیں آپؓ نے احوال معلوم کرنے پہلے بھیجا تھا کو تنہا چھوڑ دیا۔ یزید کو آپ کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے کوفہ سے نعمان بن بشیرؓ کو معزول کر کے مشہور ظالم فوجی عبید اللہ بن زیاد کو قیادت سونپی، اس نے حضرت مسلم بن عقیلؓ کو شہید کر دیا اور آپؓ کو بلانے والے سارے ابن زیاد کے ڈر سے دبک گئے، دوسری طرف آپؓ راستے میں حالات کی اطلاع ملی، آپؓ چاہتے تو واپس ہو سکتے تھے لیکن اب آپؓ مقام غیرت میں تھے، اس لیے آگے بڑھے۔ کربلا میں عمرو بن سعد جو ابن زیاد کا فوجی کمانڈر تھا کے ساتھ آمنا سامنا ہوا، آپؓ چونکہ جنگ کرنے نہیں آئے تھے، اس لیے حالات دیکھ جان لیا کہ ہم اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتے لہٰذا عمرو بن سعد کئے سامنے تین مطالبات رکھے۔ (۱) مجھے مدینہ واپس جانے دیا جائے۔ (۲) کسی اسلامی سرحد کی طرف راستہ دے دیا جائے تاکہ بقیہ زندگی سرحدات کی حفاظت یا جہاد میں گزاروں۔ (۳) یا دمشق جانے دیا جائے تاکہ میں یزید سے براہ راست گفتگو کر سکوں۔ لیکن ابن زیاد نے ان شرائط کو قبول نہ کیا اور آپ سے زبردستی بیعت لینی چاہی، مقام غیرت پر فائز کسی صدیق سے جبری بیعت لینا ناممکن ہوتا ہے، اس لیے آپ نے مظلومانہ شہادت کو

قبول کر لیا، لیکن ذلت کی بیعت گوارا نہ کی۔ اگر آپ زمینی حقائق، طاقتور کی طاقت اور ظلم و جبر سے سمجھوتہ کر کے جھک جاتے تو دنیا کے لیے عزیمت کی کوئی مثال باقی نہ رہتی۔ آپؑ نے تہی دستی و قلاشی میں حق پر ڈٹ کر جو قربانی پیش فرمائی، اس نے تا قیامت سربازوں و جانبازوں کے لیے ایک نمونہ قائم کر دیا، اب حق والے اس کی پروا نہیں کرتے کہ ان کا دشمن کتنا طاقتور ہے؟ زمینی حقائق کیا ہے؟ اپنوں نے ساتھ چھوڑ کیوں دیا؟ بس ان کی نگاہ صرف حق کے قیام پر اور شہادت کے انجام پر ہوتی ہے۔ لہذا کربلا نے ہر دور کے کمزور حق پرستوں کو جابر و ظالم حکمرانوں سے ٹکرانے کا سلیقہ سکھا دیا۔ اگر امام حسینؑ کربلا میں نہ ڈٹتے تو ملا عمر دنیا کی طاقتور نیٹو افواج کے سامنے نہ ڈٹ پاتا، اس کے پاس اسوۂ حسینی تھا لہذا وہ ڈٹ گیا اور کربلا کی طرح اسلام میں نئی روح پھونک دی۔ اگر امام عالی مقام نہ ڈٹتے تو اہل غزہ اپنی کسمپرستی، کمزوری، تہی دستی اور قلت کا بہانہ بنا کر سمجھوتہ کر لیتے، زمینی حقائق اور دشمن کی طاقت سے مرعوب ہو جاتے لیکن صد شکر کہ ان کے سامنے کربلا موجود تھا، انہوں نے اسوۂ حسینی سے سبق لیا اور طاقتوروں اور منہ زوروں کے سامنے ڈٹ گئے۔ لہذا شہادت اہل بیت نے قیامت تک اہل حق کے لیے ایک تاریخ رقم کر دی ان شاء اللہ اہل حق ہر دور میں کربلا برپا کر کے وقت کے یزید کا جینا حرام کرتے رہیں گے۔

اعلان

جن خریداران کا چندہ ختم ہو گیا ہے، براہ کرم وہ نئے سال کا زر تعاون 0336-9018418 پر ایزی پیسہ اکاؤنٹ (بنام شعیب خان) ارسال فرمائیں اور تصدیقی پیغام کے ساتھ اپنا نام، مکمل پتہ اور رابطہ نمبر بھی اسی نمبر 0336-9018418 پر واٹس ایپ کریں۔

اگر آپ تجدید فرما رہے ہیں تو تصدیقی پیغام کے ساتھ صرف اپنا خریداری نمبر بھیجیں۔

حضرت حسن بصریؒ کی حضرت علیؓ سے روایت کی تحقیق

محمد طفیل کوہاٹی

حضرت امام حسن بصریؒ علم تزکیہ اور جہاد کی جامع شخصیت گزری ہے۔ آپ کا علم و تفقہ تو طلبہ پر مخفی نہیں، تزکیہ کے بھی آپ امام ہیں اور ہمارے علاقوں پر بدھ مت حکومت کے خلاف صغار صحابہ و کبار تابعین کی یلغار میں بطور مجاہد شریک رہے، آپ مہلب بن ابی صفرۃؒ کے اس لشکر کا حصہ تھے جس نے بنوں فتح کر کے خوست تک فتح کے جھنڈے گاڑے۔ اس کا تذکرہ امام حسن بصری کے تفسیری افادات پر حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہؒ کے دکتوراہ کے مقدمہ میں عظیم مجاہد مولانا جلال الدین حقانیؒ نے کیا ہے۔

صوفیاء میں معروف ہے کہ آپ حضرت علیؓ کے خلیفہ ہیں اور صوفیاء کے پاس تواتر طبقہ کے راستے اپنا شجرہ بھی محفوظ ہے، لیکن محدثین حضرت حسن بصریؒ کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سماع تک تسلیم نہیں کرتے، لیکن اب تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ بعض محدثین نے اس کو ثابت قرار دیا ہے۔ بندہ کو عرصہ سے اس کی تلاش تھی کہ امام حسن بصریؒ کے سماع کی صراحت کہیں دستیاب ہو جائے یا تاریخی طور پر ایسی نقل دستیاب ہو جائے جو امام حسن بصری کی رؤیت حیدر کرار کو ثابت کرے۔ عقل کے اعتبار سے تو بظاہر اس رؤیت میں قطعا کوئی اشکال نہیں کیونکہ امام بصری حضرت عثمانؓ کے خطبات روایت کرتے ہیں، سینکڑوں صحابہ بمع ستر بدریین کی مدینہ میں زیارت کی ہے۔ حضرت ام سلمہؓ کے گود میں پلے بڑھے ہیں۔ ظاہر ہے حیدر کرارؓ کا مسکن دور عثمانی میں مدینہ تھا تو آپ نے کیونکر ان کی زیارت نہیں کی ہوگی۔ ابن ماجہ وغیرہ کتب حدیث میں آپ حضرت علیؓ سے کئی روایات "عن" کے ساتھ ذکر کرتے ہیں لیکن سماع کی تصریح مجھے نہیں ملی۔

چند دن قبل بردار معظم محقق و مصنف حضرت مولانا اسد اللہ پشاوری مدظلہم کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا، بندہ نے اپنی یہ طالبعلمانہ استدعا حضرت کے سامنے رکھی تو آپ نے فرمایا کہ سماع کے ثبوت پر میں نے تحقیق کی ہے اور سماع ثابت ہے۔ پھر ذکر "اجازات الحدیث" پر اپنی مایہ ناز اور شہرہ آفاق تحقیق و تعلیق سے حوالہ نکال کر دکھایا کہ مسند ابی یعلیٰ میں ایک روایت بسند صحیح منقول ہے جس میں امام حسن بصریؒ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سماع کی تصریح کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اس سند کا دراسہ آپ نے فرمایا ہے تو

فرمایا کہ المقاصد الحسنہ پر شیخ عبد اللہ غماریؒ نے اپنی تعلیق میں اس کی تحقیق کی ہے، اور ان کی تحقیق معتمد ہے۔ شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ اس زمانہ کے حافظ الحدیث اگر کوئی ہے تو وہ علامہ عبد اللہ غماریؒ ہیں۔ (تعلیق تدریب الراوی)۔ علامہ عبد اللہ غماریؒ نے یہ تحقیق المقاصد الحسنہ کی تعلیق میں بیان کی ہے۔ یہاں پہلے المقاصد الحسنہ سے علامہ سخاویؒ کی تحقیق ذکر کی جاتی ہے، اس کے بعد علامہ عبد اللہ غماریؒ کی تعلیق ملاحظہ ہو:

حديث: (لبس الخرقة الصوفية وكون الحسن البصري لبسها من علي).

قال ابن دحية وابن الصلاح إنه باطل وكذا قال شيخنا إنه ليس في شيء من طرقها ما يثبت ولم يرد في خبر صحيح ولا حسن ولا ضعيف أن النبي ألبس الخرقة على الصورة المتعارفة بين الصوفية لأحد من أصحابه ولا أمر أحدا من أصحابه بفعل ذلك وكل ما يروى في ذلك صريحا فباطل قال ثم إن من الكذب المفترى قول من قال إن عليا ألبس الخرقة الحسن البصري فإن أئمة الحديث لم يثبتوا للحسن من علي سماعا فضلا عن أن يلبسه الخرقة.

ولم يتفرد شيخنا بهذا بل سبقه إليه جماعة حتى من لبسها وألبسها كالدمياطي والذهبي والهكاري وأبي حيان والعلائي ومغلطاي والعراقي وابن الملقن والأبناسي والبرهان الحلبي وابن ناصر الدين وتكلم عليها في جزء مفرد وكذا أفردها غيره ممن توفي من أصحابنا وأوضحت ذلك كله مع طرقها في جزء مفرد بل وفي ضمن غيره من تعاليقي هذا مع الباسي إياها لجماعة من أعيان المتصوفة امتثالا لإلزامهم لي بذلك حتى تجاه الكعبة المشرفة تبركا بذكر الصالحين واقتفاء لمن أثبته من الحفاظ المعتمدين. (المقاصد الحسنة للسخاوي ص: ٥٢٧).

اس پر علامہ عبد اللہ غماریؒ لکھتے ہیں کہ بل ألبس عليا عمامة تسمى السحاب وألبس أيضا عبد الرحمن بن عوف عمامة وأرخى له عذبة. اور سماع حسن کے بارے میں لکھتے ہیں: بل ثبت سماعه في حديث، ذكرناه في تعليقنا على الحديث الآتي: مثل أمتي مثل المطر. اور آگے لکھتے ہیں: قال أبويعلى: أنا حوثرة بن أشرس، أنا عقبة بن أبي الصهباء الباهلي ، سمعتُ الحسن يقول: سمعتُ عليا يقول: قال رسول الله ﷺ : مثل أمتي مثل المطر، لايدري أوله خير أم آخره. رجاله ثقات، وفيه إثبات سماع الحسن من علي عليه السلام.(تعليق المقاصد الحسنة ص٤٣١).

بندہ نے تهذيب التهذيب ٢ / ٢٣٢ میں پڑھا تھا کہ حضرت حسن بصریؒ سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ہمیں کچھ بیان نہیں کیا؟ فرمایا: میرے مراسیل سارے انہی سے منقول ہیں لیکن حجاج بن یوسف کے فتنہ کے خوف سے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام کی صراحت نہیں کیا کرتے تھے۔

حضرت حسن بصریؒ کی حضرت علیؓ سے روایت حدیث میں سماع کے ثبوت اور خرقہ تصوف حاصل کرنے پر علامہ سیوطیؒ نے بھی مستقل رسالہ إتحاف الفرقة برفو الخرقة لکھاہے، جو الحاوي للفتاوي. للسيوطى (٢/ ٩٦) میں شامل ہے۔

علامہ نیمویؒ نے آثار السنن میں لکھا ہے: حسن بصری کی حضرت علیؓ سے اتصال ثابت ہے: اتصال الحسن بعلي ثابت بوجوه.(آثار السنن ص٣١٤، باب صلاة الكسوف بخمس ركوعات). علامہ مبارکپوریؒ نے تحفۃ الاحوذی میں ان پر رد کیا ہے، لیکن مسند ابی یعلی کی روایت کی وجہ سے انہوں نے بھی لکھا ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے تو یہ اس پر صریح نص ہے۔ ملاحظہ ہو:

وأما ما أخرجه أبو يعلي فالظاهر صحته فإن كان خاليا عن علة خفية قادحة فلا شك أنه نص صريح في سماع الحسن من علي رضي الله عنه والله تعالى أعلم.(تحفة الأحوذي ٤/ ٥٧١).

حسن بصریؒ کی صحابہ سے روایت پر ایک مفصل کتاب شیخ شریف حاتم العونی حفظہ اللہ تعالی نے لکھی ہے: المرسل الخفي وعلاقته بالتدليس، دراسة نظرية وتطبيقية على مرويات الحسن البصري، جو دار الهجرة، سے ۱۴۱۸ھ کو ۱۹۷۰صفحات میں چھپی ہے۔ مزید تحقیق کے لیے اس کتاب کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، لیکن انہوں نے اس مسئلہ پر براہ راست بحث نہیں کی ہے، دیگر کے بارے میں مفصل لکھا ہے، البتہ اصولی طور اس مسئلہ کو مکمل واضح کیا ہے۔

اس کے علاوہ اس موضوع پر ایک اور عمدہ کتاب: التابعون الثقات المتكلم في سماعهم من الصحابة ممن لهم رواية عنهم في الكتب الستة، جمع ودراسة: مبارك بن سيف الهاجري، رسالة ماجستير بالجامعة الإسلامية بالمدينة المنورة، طبع مؤسسة الريان ہے۔ جس میں حسن بصریؒ کی صحابہ کرام سے روایات کے بارے ایک ایک کر کے تحقیق کی گئی ہے، اس کتاب کے (ص۲۹۵تا۳۰۵) میں انہوں نے حسن بصریؒ کی حضرت علیؓ سے سماع کی تحقیق کی ہے، اور دیگر دلائل کے ساتھ ساتھ مسند ابی یعلی کی حدیث کی وجہ سے انہوں نے سماع کے ثبوت کو ترجیح دی ہے، ان کی بحث کا خلاصہ ملاحظہ ہو:

والخلاصة: أن الحسن البصري عاصر على بن أبي طالب رضي الله عنه وكان له من العمر عند وفاته ما يقارب تسعة عشر عاما، وقد أثبت بعض الأئمة أنه رآه بالمدينة في صباه، وجاء في مسند أبي يعلى بإسناد حسن تصريحه بالسماع منه، فثبت بهذا سماعه منه في الجملة، وأما ما رواه عن علي من قضائه في الكوفة، فالظاهر فيه الانقطاع، والله أعلم.(ص٣٠٥).

خلاصہ کلام یہ کہ حضرت علی المرتضیٰؓ سے امام حسن بصری کا سماع یعنی براہ راست حدیث سننا ثابت ہے اور حضرت حسن بصریؒ نے خود اس کی وضاحت کی ہے کہ میں حضور ﷺ سے براہ راست جتنی احادیث روایت کرتا تھا وہ میں نے حضرت علیؓ سے سن رکھی تھیں لیکن حجاج کے فتنہ کی وجہ نام نہ لینے میں مصلحت تھی، جب حضرت حسن بصریؒ کا حضرت علیؓ سماع، رؤیت وملاقات ثابت ہے تو روحانی استفادہ میں کیا تامل ہو سکتا ہے۔

اہل غزہ کی حالت زار اور ہماری ذمہ داری

عمر فاروق دیروی

اس وقت اہل غزہ جن حالات سے گزر رہے ہیں وہ بہت ہی پریشان کن اور دل خراش ہیں ، ابتدائی جنگ میں مسلمانوں نے اس مسئلہ کی طرف کسی حد تک توجہ دی تھی لیکن وقت گزرنے اور اپنے اندرونی مسائل میں مصروف ہونے کی وجہ سے مسلمانوں نے اہل غزہ کو بھلا دیا۔

اہل غزہ ہمارے مسلمان بھائی ہیں اور حدیثِ پاک میں مسلمانوں کو ایک جسم کے مانند قرار دیا گیا ہے، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ محدود کام کرنے کے بجائے ملکی سطح پر مضبوط اور منظم طریقے سے آواز اٹھائی جائے اور رہنماء اور مقتداء حضرات کو اہل غزہ کی جانب متوجہ کیا جائے تاکہ وہ اس میں اپنی مکمل اور مؤثر کردار ادا کریں اور اس آواز میں ایسی تسلسل ہو کہ وہ ختم ہونے والی نہ ہو ، اس میں انقطاع بھی نہ آئے۔

غزہ میں ہزاروں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے شہید ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں بھوک اور پیاس کی حالت سے کئی لوگوں کی حالت سخت اور کئی لوگ شہید ہو چکے ہیں، خوراک وغیرہ کی اشیاء رفح بارڈر پر موجود ہے لیکن ان کو اسرائیل غزہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتی اور مصر واضح طور پر اسرائیل کی غلامی کر رہا ہے۔

"الجزیرہ" کی رپورٹ کے مطابق اس وقت کم از کم دو ہزار کنٹینر رفح بارڈر پر صرف اس انتظار میں کھڑے ہیں کہ اسرائیل ان کو غزہ میں داخل ہونے کی اجازت دے۔

فقہاء کرامؒ نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ اگر کسی کو خوراک کی ضرورت ہو اور وہ آدمی خوراک طلب کرنے اور اس کے لئے نکلنے سے عاجز ہو تو سب لوگوں پر اس کے لئے خوراک پہنچانا فرض ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

(قال ويفترض على الناس إطعام المحتاج في الوقت الذي يعجز فيه عن الخروج والطلب)...... أن المحتاج إذا عجز عن الخروج يفترض على من يعلم أنه يطعمه مقدار ما يتقوى به على الخروج وأداء العبادات إذا كان قادرا على ذلك لقوله - صلى الله عليه وسلم - من بات شبعان وجاره إلى جنبه طاو حتى إذا مات، ولم يطعمه أحد ممن يعلم بحاله اشتركوا جميعا في المأثم لقوله - ﷺ - «أيما رجل مات جوعا بين قوم أغنياء، فقد برئت منهم ذمة الله وذمة رسوله»، فإذا لم يكن

عند من يعلم بحاله ما يعطيه، ولكنه قادر على الخروج إلى الناس فيخبر بحاله ليواسوه ويفترض عليه ذلك؛ لأن عليه أن يدفع ما يزيل ضعفه بحسب الإمكان والطاعة بحسب الطاقة فإن امتنعوا من ذلك حتى مات اشتركوا في المأثم۔
(المبسوط للسرخسي ،كتاب الكسب ، ج٣٠،ص ٢٧١)

ترجمہ:"محتاج آدمی کو جب کھانے کی ضرورت ہو اور وہ اس کے طلب کرنے اور اس کے لئے نکلنے سے عاجز ہو تو لوگوں پر اس کے لئے کھانا مہیا کرنا فرض ہے۔

محتاج جب خوراک کے لئے نکلنے سے عاجز ہو تو جو لوگ اس کے حال پر خبر ہوں،ان پر اتنی مقدار خوارک مہیا کرنا فرض ہے کہ جس سے اس کے بدن میں نکلنے اور عبادات ادا کرنے کی طاقت آجائے کہ جب یہ لوگ اس پر قادر ہو، حضور ﷺ کا فرمان ہے:

جو لوگ پیٹ بھر کر کھانا کھائے اور اسکا پڑوسی بھوکا ہو اور بھوک کی وجہ سے وفات ہو جائے تو جو لوگ اس کے حال سے باخبر ہوں وہ اس کو کھانا(خوراک وغیرہ)نہ دے تو گناہ میں سب لوگ شریک ہوں گے۔
ایک دوسری روایت میں ہے کہ جو آدمی صاحب استطاعت لوگوں کے ہاں بھوک کی وجہ سے وفات ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ان لوگوں کی کی ذمہ سے بری ہے۔

اگر اس آدمی کے حال پر کوئی خبر نہ ہو کہ وہ اس کو خوراک وغیرہ دیں لیکن یہ لوگوں کو خبر دینے پر قادر ہوں تو پھر اس آدمی پر لوگوں کو خبر کرنا فرض ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہمدردی کریں کیونکہ اس پر لازم ہے کہ یہ اپنی استطاعت وطاقت کے مطابق اپنا ضعف ختم کریں۔
اگر لوگ اس کو نکلنے سے منع کریں اور یہ وفات ہو جائے تو سب لوگ اس گناہ میں شریک ہوں گے"۔

کفار کے حملہ کے وقت جہاد کی فرضیت

حضرات فقہاء کرامؒ نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ جب مسلمانوں کے کسی شہر پر کفار حملہ آور ہو جائیں تو اس شہر والوں پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے اگر وہ لوگ جہاد کے لئے کافی نہ ہوں یا کافی ہوں لیکن جہاد کرنے میں کوتاہی، سستی اور غفلت کرتے ہوں تو ایسی صورت میں جو لوگ ان کے قریب ہوں ان پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے،اسی طرح جو قریب سے قریب تر ہوں ان پر رفتہ رفتہ جہاد فرض عین ہو جاتا ہے یہاں تک کہ سب اہل زمین پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے ،ذیل میں پوری عبارت ملاحظہ فرمائیں:

دخول الكفار بلدة من بلاد المسلمين :

ففي هذه الحالة اتفق السلف والخلف وفقهاء المذاهب الاربعة والمحدثون والمفسرون في جميع العصور الإسلامية إطلاقا أن الجهاد فى هذه الحالة يصبح فرض عين على أهل هذه

البلدة التي هاجمها الكفاروعلي من قرب منهم بحيث يخرج الولد دون إذن والده والزوجة دون إذن زوجها والمدين دون إذن دائنه فإن لم يكف أهل تلك البلدة أو قصرو أو تكاسلوا أو قعدوا يتوسع فرض العين علىٰ شكل دوائر الأقرب فالأقرب ،فإن لم يكفوا أو قصروا فعلي من يليهم ثم علي من يليهم حتي يعم فرض العين الأرض كلها.(الدفاع عن اراضي المسلمين :ص،٢٠،٢١)

ترجمہ:مسلمانوں کے کسی شہر میں کافروں کا داخل ہونا:

" اس حالت میں(کہ جب مسلمانوں کے شہر میں کافر داخل ہو)علماء،ائمہ اربعہ،محدثین،مفسرین نے تمام اسلامی زمانوں میں مطلقاً اتفاق کیاہے کہ ایسی حالت میں ان شہروں پر جہاد فرض عین ہے جن پر کفار نے حملہ کیاہو اور ان کے قریب جولوگ ہو ان پر بھی جہاد فرض عین ہے،ایسی صورت میں بیٹاباپ کی اجازت کے بغیر،بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر،مدیون دائن کی اجازت کے بغیر جہاد میں نکلے گا ،اگر یہ لوگ جہاد کے لئے کافی نہ ہو یا یہ لوگ کافی ہو لیکن کوتاہی اور سستی کرتے ہوں تو ایسی صورت میں ان کے قریب جو لوگ ہوں ان پر جہاد فرض ہے اگر وہ بھی کوتاہی اور سستی کرنے لگے تو ان کے قریب جولوگ ہوں ان پر جہاد فرض ہے،اسی طرح جو قریب سے قریب تر ہوں ان پر جہاد فرض ہو گی یہاں تک کہ سب اہل زمین پر جہاد فرض ہوجائے گی"۔

جہاد بالمال کا فریضہ

جب جہاد کرنا فرض عین ہو جاتاہے تو ایسی حالت میں مجاہدین کی مالی امداد کرنا بھی فرض ہو جاتاہے،ایسے موقع پر جب تک مجاہدین کو مال کی ضرورت ہومال جمع کرناہی درست نہیں۔ذیل میں عبارت ملاحظہ ہو:

لاشك أن الجهاد بالنفس أعلىٰ مرتبة من الجهاد بالمال ولذا فلم يعف الأغنياء في زمن الرسول ﷺمن المشاركة بأنفسهم أمثال عثمان وعبدالرحمن بن عوف رضي الله عنهما لأن صقل النفوس وتربية الأرواح إنما تتم على مستوي رفيع في خضم المعركة ......أما الجهاد بالمال فهو فرض إذا احتاج المجاهدون إليه فرض علي النساء وفي أموال الصغار حتي لوكان الجهاد فرض كفاية كماقرر ذالك ابن تيمية ولذا يحرم على الناس الإدخار في حالة الحاجة للمال ...... والحفاظ على الدّين مقدم على الحفاظ على النّفوس ، والحفاظ على النّفوس أولى من الحفاظ على المال فأموال الأغنياء ليست أغلى ولا أثمن من دماء المجاهدين.

(الدفاع عن اراضي المسلمين :ص٤١)

ترجمہ: "اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جہاد کا اعلیٰ مرتبہ وہ جہاد ہے جو جانوں کے ساتھ ہو، بخلاف جہاد بالمال کے وہ اس سے کم درجہ کاجہاد ہے،اسی وجہ سے حضور ﷺ کے زمانے میں مالدار وں کو یہ معافی نہیں تھی کہ وہ جہاد بالنفوس میں شریک نہ ہو،ایسے صحابہ کرامؓ کی مثال

حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت عبد الرحمن ابن عوفؓ ہیں۔ نفوس اور ارواح کی اعلیٰ درجے پر تربیت کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود بنفسِ نفیس معرکہ میں حاضر ہو۔ اور جب مجاہدین کو مال کی ضرورت ہو تو مال کے ساتھ بھی جہاد ضروری ہے یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں کے مال میں بھی مال کے ساتھ جہاد ضروری ہو جاتی ہے ،اور علامہ ابن تیمیہؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر جہاد فرض کفایہ ہو تو ایسی صورت میں جہاد بالمال فرض ہے، لہذا اگر جہاد میں مال کی ضرورت ہو تو پھر مال کو جمع کرنا حرام ہے۔

دین کی حفاظت جانوں کی حفاظت پر مقدم ہے اور جانوں کی حفاظت مالوں کی حفاظت پر مقدم ہے تو مالداروں کا مال و جائیداد مجاہدین کے خون سے زیادہ قیمتی نہیں ہے"۔

ہماری ذمہ داریاں

ان سخت حالات میں ہماری اخلاقی اور شرعی ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اہل غزہ کا ساتھ دیں ، صرف زبانی نہیں، بلکہ ان کے ساتھ جانی و مالی تعاون کریں اور ہمارا یہ عذر کہ "ہم کچھ نہیں کر سکتے" قابل قبول نہیں ہے، ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن اگر عزم مصمم کرلیں، سچ بات یہ ہے کہ ہم نے اس کام کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔

ہمارے اکابرین اور اسلاف نے اس سے سخت حالات میں امت کی رہبری اور رہنمائی فرمائی ہے اور اس سے سخت حالات سے امت کو نکالا ہے، اس لئے ایک بار پھر امت کے اتفاق و اتحاد اور امت کے موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ اہل علم اور مقتداء حضرات آگے ہو کر امت کی صحیح رہنمائی فرمائیں، اسی میں ہم سب کی فلاح ہے اور اسی میں ہم سب کی خلاصی ہے۔

اگر ہم پوری صلاحیت اور استعداد کے ساتھ اس اہم فریضہ کی طرف متوجہ ہو جائیں تو ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

اس وقت دشمنانِ اسلام متحد ہو کر ایک ہو چکے ہیں اور مسلمان اب بھی ایک دوسرے کے ساتھ اختلافات میں الجھے ہوئے ہیں۔

موجودہ حالات کو دیکھ کر ہم میں سے ہر ایک آدمی اپنے آپ سے یہ سوالات کریں کہ:

۱: کیا ہمیں حضور ﷺ نے انسانیت کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا درس نہیں دیا؟

۲: کیا مظلوم کی مدد اور ظالم کو ظلم سے روکنا حضور ﷺ کی سیرت کا ایک روشن باب نہیں؟

۳: کیا سیرت میں "حلف الفضول" کے نام سے ایک معاہدہ مشہور نہیں؟

کہ حضور ﷺ کی نبوت سے پہلے ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں ایک تاجر اپنا سامانِ تجارت بیچنے کے لئے

آیا، عاص بن وائل نے اس تاجر کا مال خرید لیا لیکن اس کی قیمت ادا کرنے سے انکار کیا، تاجر نے مکہ والوں سے فریاد کی اور ان سے مدد کی درخواست کی، اس موقع پر مکہ کے زندہ ضمیر اور باہمت لوگوں نے باہم مل بیٹھ کر یہ عہد کیا کہ ہم مظلوموں کی مدد کریں گے، ظالموں سے ان کا حق دلوائیں گے، اس معاہدے میں حضور ﷺ بھی شریک ہوئے تھے اور نبوت ملنے کے بعد حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے:

"اگر اس جیسے معاہدے میں شریک ہونے کے لئے اب بھی مجھے بلایا جائے تو میں ضرور اس میں شرکت کروں گا۔(سیرة ابن هشام، ج١ ص١٣٤، سبل الهدی والرشاد في سيرة خير العباد، ج٢، ص ١٥٤)

یہ واقعہ حضور ﷺ کی انسانی ہمدردی اور انسانیت کی بنیاد پر خیر خواہی اور تعاون کی عکاسی کرتا ہے۔

اس خون آشامی، ظلم و بربریت، قتل و غارت کو دیکھنے اور تماشائی بننے کے بجائے اس ظلم کو روکنا اور عالمی سطح پر تسلسل کے ساتھ اس ظلم کے خلاف بھرپور تحریک اٹھانے کی ضرورت ہے۔

امت میں چنگاری موجود ہے، صرف پھونکنے کی ضروت ہے، امت بیدار ہے صرف رہنماء کی ضرورت ہے۔ ہم سب کو متحد ہو کر اس مشن کو آگے لے جانا ہے، ہم سب کو اپنی اندرونی مسائل کے بجائے امت کے اجتماعی مسائل کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس اہم فریضہ کی طرف توجہ دینے اور کام کرنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔

دوا کے شرعی اصول۔ احادیثِ صحاحِ ستہ کی روشنی میں

ڈاکٹر فہد انوار

ذخیرہ ءحدیث پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات میں طب سے متعلق ارشاداتِ گرامی بھی موجود ہیں۔ محدثینِ کرام اپنی کتاب میں کتاب الطب یا ابواب الطب کے نام سے عنوان قائم کرکے آنحضرت ﷺ کے وہ ارشادات گرامی ذکر کرتے ہیں جن کا تعلق دوا، علاج اور اس کے ان طریقوں سے ہوتا ہے جو آنحضرت ﷺ کے مبارک دور میں رائج تھے۔ ان ارشادات کی روشنی میں فقہائے کرام نے دوا اور علاج کے متعلق بحث فرمائی ہے۔ شرّاحِ حدیث ان احادیث کی شرح کرتے ہوئے ایسی بحث بھی فرماتے ہیں جن سے موجودہ زمانے میں دوا اور علاج کی مختلف انواع کا حکم متعین کیا جاسکتا ہے۔ اس مضمون میں احادیثِ صحاح ستہ کی دوا کے متعلق احادیث کو سامنے رکھ کر ان سے نکلنے والے دوا کے شرعی اصولوں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ اکثر احادیث صحاحِ ستہ کی کتاب الطب سے لی گئی ہیں۔ تاہم بضرورت دیگر ابواب یا دیگر کتب سے بھی روایات لی گئی ہیں۔

دوا کے استعمال کی ترغیب

عَنْ أُسَامَةَ بْنِ شَرِيكٍ، قَالَ: قَالَتِ الأَعْرَابُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَلَا نَتَدَاوَى؟ قَالَ: "نَعَمْ، يَا عِبَادَ اللَّهِ تَدَاوَوْا، فَإِنَّ اللَّهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً إِلَّا وَضَعَ لَهُ شِفَاءً، أَوْ قَالَ: دَوَاءً إِلَّا دَاءً وَاحِدًا" قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، وَمَا هُوَ؟ قَالَ: «الهَرَمُ»: وَفِي البَابِ عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ، وَأَبِي هُرَيْرَةَ، وَأَبِي خُزَامَةَ، عَنْ أَبِيهِ، وَابْنِ عَبَّاسٍ وَهَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ[1]

> اسامہ بن شریکؓ کہتے ہیں کہ دیہاتیوں نے آپ ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ کیا ہم (بیماریوں کا) علاج کیا کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں: اللہ کے بندو! علاج کرو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بیماری پیدا کی ہے اس کی دوا بھی ضرور پیدا کی ہے، سوائے ایک بیماری کے،

۱۔ سنن الترمذی، ابواب الطب باب ما جآ فی الدواءعلیه والحث ،۲۰۳۸

لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! وہ کون سی بیماری ہے؟ آپ نے فرمایا: بڑھاپا

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَا أَنْزَلَ اللَّهُ دَاءً إِلَّا أَنْزَلَ لَهُ شِفَاءً»١

نبیءاکرم ﷺ کا رشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی بیماری نہیں اتاری جس کی شفا نہ اتاری ہو۔

عَنْ جَابِرٍ، عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: «لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ، فَإِذَا أُصِيبَ دَوَاءُ الدَّاءِ بَرَأَ بِإِذْنِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ»٢

جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر بیماری کی دوا ہے، پس جب دوا بیماری کے مطابق پہنچ جاتی ہے تو اللہ عزوجل کے حکم سے مریض تندرست ہو جاتا ہے۔

عَنْ أُسَامَةَ بْنِ شَرِيكٍ، قَالَ: شَهِدْتُ الْأَعْرَابَ يَسْأَلُونَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَعَلَيْنَا حَرَجٌ فِي كَذَا؟ أَعَلَيْنَا حَرَجٌ فِي كَذَا؟ فَقَالَ لَهُمْ: «عِبَادَ اللَّهِ، وَضَعَ اللَّهُ الْحَرَجَ، إِلَّا مَنِ اقْتَرَضَ، مِنْ عِرْضِ أَخِيهِ شَيْئًا، فَذَاكَ الَّذِي حَرِجَ» فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ: هَلْ عَلَيْنَا جُنَاحٌ أَنْ لَا نَتَدَاوَى؟ قَالَ: «تَدَاوَوْا عِبَادَ اللَّهِ، فَإِنَّ اللَّهَ، سُبْحَانَهُ، لَمْ يَضَعْ دَاءً، إِلَّا وَضَعَ مَعَهُ شِفَاءً، إِلَّا الْهَرَمَ» ، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا خَيْرُ مَا أُعْطِيَ الْعَبْدُ قَالَ: «خُلُقٌ حَسَنٌ»٣

اسامہ بن شریکؓ کہتے ہیں کہ میں نے اعرابیوں کو نبی اکرم ﷺ سے سوال کرتے دیکھا کہ کیا فلاں معاملے میں ہم پر گناہ ہے؟ کیا فلاں معاملے میں ہم پر گناہ ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بندو! ان میں سے کسی میں بھی اللہ تعالیٰ نے گناہ نہیں رکھا سوائے اس کے کہ کوئی اپنے بھائی کی عزت سے کچھ بھی کھیلے، تو دراصل یہی گناہ ہے ، انہوں نے کہا: اللہ کے رسول! اگر ہم دوا علاج نہ کریں تو اس میں بھی گناہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بندو! دوا علاج کرو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا مرض نہیں بنایا جس کی شفاء اس کے ساتھ نہ بنائی ہو سوائے بڑھاپے کے ، انہوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! بندے کو جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں ان میں سے سب بہتر چیز کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: حسن اخلاق۔

مذکورہ بالا احادیث سے علاج کی ترغیب ملتی ہے اور خود نبیءاکرم ﷺ نے بعض امراض کا علاج بھی بتایا ہے۔ اسی بنا پر بعض علماء نے علاج کو سنت یا مستحب قرار دیا ہے۔ تاہم احادیث میں توکل کی بھی تعلیم ہے جس کا

١۔صحیح بخاری،کتاب الطب، بَابُ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ دَاءً إِلَّا أَنْزَلَ لَهُ شِفَاء ،٥٦٧٨

٢۔صحیح مسلم،باب لكل داء دواء واستحباب التداوی،رقم ٢٢٠٤

٣۔ابن ماجه،کتاب الطب ،باب ما انزل الله داءالا انزل له شفاء،٣٤٣٦

نتیجہ یہ ہے کہ مؤثرِ حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور تمام اسباب اس کے حکم سے نفع یا نقصان دیتے ہیں۔ پھر اسباب کی تاثیر کے اعتبار سے تین اقسام ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جن کی تاثیر یقینی یا تقریباً یقینی ہے مثلاً بھوک کے دور کرنے میں روٹی کا اثر اور پیاس دور کرنے میں پانی کا اثر۔ دوسری قسم وہ ہے جس کی تاثیر ظنِ غالب کے درجے میں ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جس کی تاثیر کے نفع بخش ہونے میں وہم ہو۔

دوا اور علاج کا معاملہ بھی اس قسم کا ہے کہ ان کی تاثیر یقینی نہیں بلکہ ظنِ غالب کے درجہ میں ہوتی ہے۔ جبکہ علاج کی ایک قسم وہ بھی ہے جس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اس سب کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے علاج کا حکم بھی مختلف ہوگا۔ چنانچہ مرض اگر مہلک ہو اور اس کے لئے ایسی دوا بھی موجود ہو جس سے فائدہ ظنِ غالب کے درجے میں ہو تو اس صورت میں قدرت ہوتے ہوئے علاج کرنا واجب ہوگا۔ جبکہ اگر مرض عام نوعیت کا ہو تو علاج کرانا سنت و مستحب ہوگا۔ اور علاج نہ کرنے والا گنہگار نہیں ہوگا۔[1]

مضر دوا استعمال کرنے کی ممانعت

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «[ص:١٤٠] مَنْ تَرَدَّى مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهُ، فَهُوَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ يَتَرَدَّى فِيهِ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا، وَمَنْ تَحَسَّى سُمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهُ، فَسُمُّهُ فِي يَدِهِ يَتَحَسَّاهُ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا، وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِحَدِيدَةٍ، فَحَدِيدَتُهُ فِي يَدِهِ يَجَأُ بِهَا فِي بَطْنِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا»[2]

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اپنے آپ کو لوہے کے ہتھیار سے قتل کیا تو وہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہوگا اور اس ہتھیار سے اپنے پیٹ کو زخمی کرتا رہے گا، ہمیشہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں رہے گا اور جس نے زہر پی کر اپنے آپ کو قتل کیا تو وہ اسے چوستا رہے گا اور دوزخ کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور جس نے اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا کر قتل کیا تو وہ پہاڑ سے یوں ہی گرتا رہے گا اور ہمیشہ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں رہے گا۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: «نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الدَّوَاءِ الخَبِيثِ»: يَعْنِي السُّمَّ[3]

رسول اللہ ﷺ نے خبیث دوا استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے۔

۱۔کشف الباری کتاب الطب، ص۵۳۵ ج۴۔

۲۔ (ایضا بَابُ شُرْبِ السُّمِّ وَالدَّوَاءِ بِهِ وَبِمَا يُخَافُ مِنْهُ وَالخَبِيثِ،۵۷۷۸)

۳۔ (ترمذی، ابواب الطب، بَابُ مَا جَاءَ فِيمَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِسُمٍّ أَوْ غَيْرِهِ

انسانی جان اللہ تعالیٰ کی امانت ہے جو اس نے اپنے بندے کے سپرد کی ہے۔اس نعمت کی قدر دانی اس کا شکریہ ہے۔ کسی انسان کو اپنے کسی عضو یا زندگی کو ضائع یا ختم کرنے کی اجازت نہیں۔ ایسا علاج اور ایسی دوا جس سے عضو ضائع ہو جائے شرعا جائز نہیں۔خودکشی کرنے والا شخص اللہ تعالیٰ کی سپرد کی ہوئی امانت میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔اس کے عمل سے یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنے آپ کو جان کا مالک سمجھ رہا ہے۔ مندرجہ بالا حدیث میں خودکشی پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے الفاظ بھی آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خودکشی انتہائی مکروہ عمل ہے۔ اگر کوئی جائز سمجھ کر کرتا ہے تو پھر تو حرام کو جائز سمجھنے کی وجہ سے کافر ہو کر مرا لہٰذا اس کی بخشش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم اگر کوئی اسے گنا سمجھتا ہے پھر اس کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ گنہگار مسلمان ہو گا جس کی کبھی نہ کبھی بخشش کی امید ہے۔

یوتھینیزیا Mercy Killing کا شرعی حکم

مریض انتہائی تکلیف میں ہو تو اس کی فرمائش پر یا ازخود ایسا طریقہ استعمال کرنا جس سے مریض کی جان ختم ہو جائے۔ اگر کوئی شخص اپنے طور پر ایسی دوا استعمال کرے جو قاطعِ حیات ہو یا اپنے آپ کو کسی مہلک آلے سے زخمی کر کے مر جائے تو یہ خودکشی ہو گی اور کتاب وسنت کی تصریحات کے خلاف ہے۔ اگر طبیب مریض کی فرمائش پر یا ازخود ایسی دوا جسم میں ڈاخل کرے جو قاطعِ حیات ہو یا کسی مہلک ذریعے سے مار دے یا ایسا علاج جس سے مریض کی شفا کا گمانِ غالب ہو، اسے ارادۃ روک دے تو یہ اس کی طرف سے قتل یا اقدامِ قتل ہو گا۔اسی لئے یوتھینیزیا ناجائز اور حرام ہے۔

حضرت طفیل بن عمر دوسیؓ کے ساتھ ایک اور صاحب نے مدینہ ہجرت کی، وہ دوسرے صاحب بیمار پڑ گئے، تکلیف کی شدت کے باعث ان سے صبر نہ ہو سکا اور ایک ہتھیار سے اپنی اُنگلیوں کے جوڑ کاٹ لئے، رگیں کٹ گئیں اور خون اتنا بہہ گیا کہ انتقال ہو گیا، حضرت طفیلؓ نے انہیں خواب میں دیکھا کہ وہ بہتر حالت میں ہیں، لیکن ان کے ہاتھ ڈھکے ہوئے ہیں، حضرت طفیلؓ نے دریافت کیا کہ آپ کے رب نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ ان صاحب نے کہا: اللہ نے ہجرت کی وجہ سے مجھے معاف کر دیا، لیکن میرے ہاتھوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ جس چیز کو تم نے خود بگاڑ لیا ہے، میں اسے درست نہیں کر سکتا، حضرت طفیلؓ نے یہ خواب حضور ﷺ سے بیان کیا، آپ ﷺ نے دُعا فرمائی کہ اے اللہ! ان کے ہاتھوں کو بھی معاف فرما دے۔[1]

حضرت جندبؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے کی قوموں میں ایک شخص کو

۱۔ صحیح مسلم، رقم ۱۱۶

زخم تھا، وہ تکلیف برداشت نہ کرسکا، چھری لی اور اس سے اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا، خون تھم نہ سکا اور موت واقع ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میرے بندہ نے اپنی ذات کے معاملہ میں مجھ پر سبقت کرنے کی کوشش کی، اس لئے میں نے اس پر جنت حرام کردی۔[1]

رسول اللہ ﷺ رحمت مجسم تھے، لیکن اس کے باوجود حضرت جابر بن سمرہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے خودکشی کرلی تو آپ ﷺ نے اس پر نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔[2] اسی لئے امام احمدؒ بن حنبل کا خیال ہے کہ خودکشی کرنے والے شخص پر عام لوگ تو نمازِ جنازہ پڑھیں گے؛ لیکن امام المسلمین نماز جنازہ نہیں پڑھے گا۔[3]

خمر (شراب) کو بطور دوا استعمال کرنے کی ممانعت

حَدَّثَنَا مَحْمُودُ بْنُ غَيْلَانَ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو دَاوُدَ، عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ سِمَاكٍ، أَنَّهُ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَائِلٍ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّهُ شَهِدَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَأَلَهُ سُوَيْدُ بْنُ طَارِقٍ، أَوْ طَارِقُ بْنُ سُوَيْدٍ عَنِ الخَمْرِ فَنَهَاهُ عَنْهُ [ص:٣٨٨] فَقَالَ: إِنَّا نَتَدَاوَى بِهَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّهَا لَيْسَتْ بِدَوَاءٍ وَلَكِنَّهَا دَاءٌ» حَدَّثَنَا مَحْمُودٌ قَالَ: حَدَّثَنَا النَّضْرُ بْنُ شُمَيْلٍ، وَشَبَابَةُ، عَنْ شُعْبَةَ، بِمِثْلِهِ، قَالَ مَحْمُودٌ: قَالَ النَّضْرُ: طَارِقُ بْنُ سُوَيْدٍ، وَقَالَ شَبَابَةُ: سُوَيْدُ بْنُ طَارِقٍ: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ[4]

علقمہ بن وائل اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے جب سوید بن طارق یا طارق بن سوید نے آپ سے شراب کے بارے میں پوچھا تو آپ نے انہیں شراب سے منع فرمایا، سوید نے کہا: ہم لوگ تو اس سے علاج کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" :وہ دوا نہیں بلکہ وہ تو خود بیماری ہے۔

آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ طیبہ اس بارے میں واضح ہیں کہ خمر حرام ہے اور اس کا پینا اور کسی قسم کا استعمال جائز نہیں۔ البتہ بطور دوا اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلے کا تعلق تداوی بالمحرم سے ہے یعنی حرام چیز سے علاج جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ خمر ایک ایسا مشروب ہے جو نشہ آور ہو اور جس کے پینے سے انسان کی عقل متاثر ہو جائے۔ اسی کو اردو میں شراب اور انگریزی میں الکحل کہتے ہیں۔ کتاب و سنت میں خمر کی

۱۔ صحيح البخاری، رقم ٣٤٦٣

۲۔ صحيح مسلم، رقم ٩٧٨

۳۔ سنن الترمذی، رقم ١٠٦٨

۴۔ ترمذی، ابواب الطب، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ التَّدَاوِي بِالمُسْكِرِ، ٢٠٤٦

سختی سے ممانعت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔[1]

اے ایمان والو! شراب، جوا، بتوں کے تھان اور جوئے کے تیر سب یہ سب ناپاک شیطانی کام ہیں، لہٰذا ان سے بچو، تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔

نبیء اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے بھی خمر سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ»[2]

ابن عمر رضی اللہ عنہما نبیء اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ ہر نشہ آور چیز شراب ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔

«إِنَّ اللهَ لَمْ يَجْعَلْ شِفَاءَكُمْ فِيمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ»[3]

اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو تم پر حرام کیا اس میں تمہاری شفا نہیں رکھی۔

آج کل بہت سی دواؤں اور خوشبوؤں میں الکحل کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ ایک کیمیائی مادہ ہے جو مختلف پھلوں اور اناج کے نشاستہ (carbohydrate) یا شکر سے بنایا جاتا ہے۔ اس کی بہت ساری قسمیں ہیں جن میں صرف ایک قسم نشہ آور ہے۔ چونکہ الکحل کا استعمال نشہ آور مشروب کے طور پر بھی ہوتا ہے جسے عام اصطلاح میں شراب ہی کہا جاتا ہے اور اس کے نتائج بھی وہی ہوتے ہیں جو خمر کے ہوتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ الکحل کی وہ اقسام بھی ہیں جو دواؤں اور عطریات میں استعمال ہوتی ہیں لہٰذا اس کا حکم سمجھنے کے لئے نشہ آور مشروبات کا حکم جاننا ضروری ہے۔ اس حوالے سے الدر المختار میں علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

شراب لغت میں ہر مائع مشروب کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں جو مسکر (نشہ آور) ہو۔ ان مشروبات میں سے چار حرام ہیں:

۱۔ الخمر (شراب) انگور کا کچا رس جب جوش مارے، سخت ہو جائے اور جھاگ مارے۔ اس کا قلیل و کثیر

۱۔ المائدہ: ۹۰

۲۔ شرح معانی الآثار، امام طحاوی، باب ما یحرم من النبیذ، ۶۴۳۵

۳۔ ایضا، باب حکم بول ما یؤکل لحمہ، ۶۵۲

بالاجماع حرام ہے۔

۲۔ الطلاء: اس شراب کو کہتے ہین کہ انگور کے رس کو اتنا پکایا جائے کہ اس میں سے دو تہائی (۲/۳) اڑ جائے اور ایک تہائی (۱/۳) باقی رہ جائے۔ اور اس میں نشہ پیدا ہو جائے۔

۳۔ السکر: تازہ کھجور کا کچا پانی جب اس میں شدت آجائے اور جھاگ چھوڑ دے۔

۴۔ نقیع الزبیب کشمش کا کچا پانی جب اس میں کشمش کو رکھا جائے یہاں تک کہ جوش مارنے کے بعد جھاف چھوڑنے لگے۔[1]

یہ آخری تین اس وقت حرام ہیں جب ان میں جوش وشدت پیدا ہو جائے۔ ان آخری تین کو پی کر نشے میں آنے والے پر سزا جاری کی جائے گی۔ جبکہ خمر کو تھوڑی مقدار مین پینے والا اگر نشہ میں نہ آئے تب بھی اس پر حد جاری کی جائے گی۔

ان چار کے علاوہ سے بننے والی الکحل کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ کا مذھب یہ ہے کہ ان کی اس قدر قلیل مقدار جو نشہ آور نہ ہو حرام نہیں اور نہ ہی نجس ہے۔ آج کل دواؤں اور خوشبوؤں میں جو الکحل استعمال کی جاتی ہے وہ انگور اور کھجور کے علاوہ سے بنائی جاتی ہے لہٰذا حضرت امام ابو حنیفہؒ کے قول پر اہلِ علم حضرات ان کے استعمال کی گنجائش دیتے ہیں۔[2]

حرام چیز کو بطور دوا استعمال کرنا

اللہ تعالیٰ نے اپنی بنائی ہوئی اشیا میں ایسی بھی بنائی ہیں جن کو کھانا یا استعمال کرنا جائز رکھا اور ایسی بھی بنائی جن کا کھانا اور استعمال کرنا ناجائز رکھا۔ حرام اشیاء سے بچنا اور حلال کو اختیار کرنا انسان کی سعادت ہے۔ تاہم انتہائی ضرورت میں حرام شے کو بطور دوا اور علاج استعمال کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں فقہاء کی آرا مختلف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں احادیث مختلف ہیں اور اسی اختلاف نے رحمت بن کر امت کے بیماروں اور ضعفا کے لئے آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ ہم پہلے ان روایات کو پیش کرتے ہیں جن سے تداوی بالمحرم (یعنی حرام سے علاج کی ممانعت) معلوم ہوتی ہے:

عَنْ أُمِّ الدَّرْدَاءِ، عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ

۱۔ الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الاشربه، ۴۴۸ - ۴۵۲، ج٦، دارالفکر بیروت

۲۔ تکمله فتح الملهم، حکم الکحول المسکره، ص۶۰۸ ج۳، مکتبه دارالعلوم کراتشی

الدَّاءَ وَالدَّوَاءَ، وَجَعَلَ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءً فَتَدَاوَوْا وَلَا تَدَاوَوْا بِحَرَامٍ»[1]

ابودرداؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یقینا اللہ تعالیٰ نے بیماری اور دوا اتاری ہیں اور ہر بیماری کے لئے دوا بھی بنائی ہے لہٰذا علاج کرو اور حرام سے علاج مت کرو۔

امام طحاویؒ حضرت ابنِ مسعودؓ کا ارشاد نقل کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام چیز میں شفا نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔

«إِنَّ اللهَ لَمْ يَجْعَلْ شِفَاءَكُمْ فِيمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ»[2]

اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو تم پر حرام کیا اس میں تمہاری شفا نہیں رکھی۔

دوسری طرف ایسی روایات بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبیءاکرم ﷺ نے کچھ مخصوص حالات میں ایسی چیز کو بطور دوا تجویز فرمایا جس کا استعمال عام حالات میں جائز نہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: «أَنَّ نَاسًا اجْتَوَوْا فِي المَدِينَةِ، فَأَمَرَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَلْحَقُوا بِرَاعِيهِ - يَعْنِي الإِبِلَ - فَيَشْرَبُوا مِنْ أَلْبَانِهَا وَأَبْوَالِهَا، فَلَحِقُوا بِرَاعِيهِ، فَشَرِبُوا مِنْ أَلْبَانِهَا وَأَبْوَالِهَا، حَتَّى صَلَحَتْ أَبْدَانُهُمْ، فَقَتَلُوا الرَّاعِيَ وَسَاقُوا الإِبِلَ، فَبَلَغَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَبَعَثَ فِي طَلَبِهِمْ فَجِيءَ بِهِمْ [ص:١٢٤]، فَقَطَعَ أَيْدِيَهُمْ وَأَرْجُلَهُمْ، وَسَمَرَ أَعْيُنَهُمْ» قَالَ قَتَادَةُ: فَحَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ سِيرِينَ: «أَنَّ ذَلِكَ كَانَ قَبْلَ أَنْ تَنْزِلَ الحُدُودُ»[3]

انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ (عرینہ کے) کچھ لوگوں کو مدینہ منورہ کی آب و ہوا موافق نہیں آئی تھی تو نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ وہ آپ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کے چرواہے کے ہاں چلے جائیں یعنی اونٹوں میں اور ان کا دودھ اور پیشاب پئیں۔ چنانچہ وہ لوگ نبی کریم ﷺ کے چرواہے کے پاس چلے گئے اور اونٹوں کا دودھ اور پیشاب پیا جب وہ تندرست ہو گئے تو انہوں نے چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹوں کو ہانک کر لے گئے۔ آپ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے انہیں تلاش کرنے کے لیے لوگوں کو بھیجا جب انہیں لایا گیا تو نبی کریم ﷺ کے حکم

١۔ سنن ابی داود، کتاب الطب، باب فی الادویة المکروهة، ٣٨٧٤

٢۔ شرح معنی آلاثار، باب حکم بول ما یؤکل لحمه، ٦٥٢

٣۔ بخاری، باب الدواء بابوال الابل، ٥٦٨٦

سے ان کے بھی ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے گئے اور ان کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی (جیسا کہ انہوں نے چرواہے کے ساتھ کیا تھا)۔ قتادہ نے بیان کیا کہ مجھ سے محمد بن سیرین نے بیان کیا کہ یہ حدود کے نازل ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔

اس حدیث کی روشنی میں فقہائے کرام نے اس پر بحث فرمائی ہے کہ شریعت کی حرام کردہ اشیاء کو بطور دوا استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔بظاہر اس حدیث سے جواز معلوم ہورہا ہے۔جب کہ پیشاب کی حرمت دیگر روایات کی روشنی میں واضح ہے نیز پیشاب سے جس تاکید کے ساتھ بچنے کا حکم ہے، اس کا تقاضا ہے کہ پیشاب پینے کی ممانعت ہو۔اس روایت کے پس منظر میں فقہائے کرام نے اس پر بحث فرمائی ہے کہ مریض کے لئے علاج کی حد تک جائز متبادل موجود نہ ہونے کی صورت میں حرام چیز کو بطور دوا استعمال کرنا کیسا ہے؟ اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

حنابلہ کے نزدیک حرام سے علاج کسی صورت میں جائز نہیں۔

شوافع کے نزدیک ایسی حرام اشیاء کا استعمال دوا کے لے جائز ہے جس میں نشہ نہ ہو۔

مالکیہ کے نزدیک بھی اس کا استعمال جائز نہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حرام سے علاج کسی صورت میں جائز نہیں۔امام محمدؒ کے نزدیک علاج کے لئے ایسے جانوروں کا پیشاب پینا جائز ہے کیونکہ وہ پاک ہے۔امام ابو یوسف کے نزدیک علاج کی حد تک حرام اشیاء کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔اسی پر متاخرین احناف کا فتویٰ ہے۔[1]

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

"يجوز للعليل شرب البول والدم وأكل الميتة للتداوي إذا أخبره طبيب مسلم أن شفاءه فيه ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه [2]

بیمار کے لئے پیشاب اور خون اور مردار کا کھانا دوا کے طور پر جائز ہے جب مسلمان طبیب اسے اس بات کی خبر دے کہ اس میں شفا ہے اور اس کے قائم مقام دوسری جائز چیز بھی نہ ہو۔

الدر المختار میں ہے:

اختلف في التداوي بالمحرم وظاهر المذهب المنع كما في رضاع البحر، لكن نقل

۱۔فقہی مقالات، مفتی محمد تقی عثمانی، ج ۴ ص ۱۳۸ تا ۱۴۴

۲۔الهندية، كتاب الكراهية الباب الثامن عشر في التداوي والمعالجات، ۵/۴۱۰

المصنف ثمة وهنا عن الحاوي: وقيل يرخص إذا علم فيه الشفاء ولم يعلم دواء آخر كما رخص الخمر للعطشان وعليه الفتوى۔[1]

حرام کو دوا کے طور پر استعمال کرنے کے مسئلے میں اہلِ علم میں اختلاف ہے۔۔۔اور کہا گیا ہے کہ جب اس حرام میں شفا معلوم ہو اور کوئی دوسری دوا معلوم نہ ہو جیسا کہ پیاسے کے لئے (پانی نہ ہونے کی صورت میں بقدرِ ضرورت) شراب کی رخصت دی گئی ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

علاج کی غرض سے جسم کو جلانا

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ: " الشِّفَاءُ فِي ثَلاَثَةٍ: شَرْبَةِ عَسَلٍ [ص:١٢٣]، وَشَرْطَةِ مِحْجَمٍ، وَكَيَّةِ نَارٍ، وَأَنْهَى أُمَّتِي عَنِ الكَيِّ " رَفَعَ الحَدِيثَ وَرَوَاهُ القُمِّيُّ، عَنْ لَيْثٍ، عَنْ مُجَاهِدٍ، عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «فِي العَسَلِ وَالحَجْمِ»[2]

آنحضرت ﷺ سے جسم کو داغنے کے متعلق دو طرح کی روایات نقل کی گئی ہیں۔ایک طرح کی احادیث جن میں سے ایک مندرجہ بالا بھی ہے،وہ ہیں جن میں ممانعت وارد ہے۔دوسری طرح کی روایات وہ ہیں جن سے اس طریقہء علاج کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ مثلا

عَن جابرٍ قَالَ: رُمِيَ أَبِي يَوْمَ الْأَحْزَابِ عَلَى أَكْحَلِهِ فَكَوَاهُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. رَوَاهُ مُسلم[3]

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ جنگِ خندق کے دن حضرت ابیؓ کی ہاتھ کی رگ اکحل پر تیر لگا جس سے خون جاری ہو گیا تو نبیء اکرم ﷺ نے اسے داغا۔

مشکوٰۃ شریف میں دونوں طرح کی روایات ساتھ ساتھ موجود ہیں۔اسی بنا پر شراحِ حدیث نے ممانعت کو نہی تنزیہی پر محمول کیا ہے اور ضرورت کے وقت بطور دوا و علاج اسے جائز قرار دیا ہے۔

دونوں طرح کی روایات کو سامنے رکھ کر علماء نے اس طرح تطبیق پیدا کی ہے کہ ضرورت کے وقت مرض کے علاج کے لئے آگ سے جسم کے کسی حصے کو داغنا یا جلانا جائز ہے مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ:

اس مرض کے لئے کوئی متبادل جائز علاج موجود نہ ہو اور طبی تجربے سے اس کا نافع ہونا بھی معلوم ہو۔

البتہ عام حالات میں جائز متبادل کے موجود ہوتے ہوئے اس طریقے کو اختیار کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس

١۔الدر المختار وحاشية ابن عابدين (رد المحتار) (١/ ٢١٠

٢۔(صحيح بخارى،كتاب الطب، باب الشفاء فى الثلاث، ٥٦٨٠)

٣۔ مشكوة المصابيح،كتاب الطب رقم٤٥١٧)

میں مندرجہ ذیل خرابیاں پائی جاتی ہیں۔

ممانعت کا تعلّق ہلاکتِ جان کے خطرے سے ہے، یعنی اگر ایسی صورت ہو کہ داغنے کی وجہ سے فائدے کے بجائے نقصان اور جان کے ہلاک ہونے کا خوف ہو تو داغنے سے گریز کرنا چاہیئے، لیکن اگر یہ خطرہ نہ ہو تو کیا جاسکتا ہے۔

تکلیف دہ طریقہء علاج اختیار کرنا

جسم کو آگ سے جلانا

یہاں شارحین نے ایک یہ بات بھی لکھی ہے کہ زمانہء جاہلیت میں عرب علاج کے اس طریقے کو جسے اس حدیث میں کی کہا گیا ہے، اس قدر مؤثر سمجھتے تھے کہ مشہور ہو گیا تھا کہ آخر العلاج الکی یعنی آخری علاج تو داغنا ہی ہے۔ اس لئے بھی آنحضرت ﷺ نے اسے پسند نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ایک طرح مشرکین کے اس عقیدے کے ساتھ مشابہت پائی جارہی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ مؤثرِ حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ قرآن وحدیث میں جابجا توکل کی تعلیم ہے جس کا تقاجا یہ ہے کہ کسی علاج اور کسی دوا کو اپنی ذات میں نافع یا ضار نہ سمجھا جائے بلکہ اللہ تعالیٰ کی منشا کا پابند سمجھا جائے۔

کشف الباری میں ہے:

ممانعت کا تعلق زمانہ جاہلیت کے فاسد عقیدے سے ہے، عربوں میں داغنے کے عمل کو علاج کا سببِ مؤثر سمجھتے تھے، اِس لئے آپ ﷺ نے اِس شرکِ خفی سے بچنے کے لئے اِس کو ممنوع قرار دیا، پس اگر کسی کا یہ عقیدہ نہ ہو، بلکہ ظاہری سبب کے طور پر وہ اختیار کرے تو کوئی حرج نہیں، وہ جائز ہے۔[1]

دارالافتابنوری ٹاؤن سے علاج کی خاطر ہاتھ اور پاؤں کو داغنے کے بارے میں پوچھا گیا تو جو جواب صادر کیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے:

حاصل یہ کہ کسی عضو کو داغنا یا جلانا مکروہ ہے ہاں اگر کوئی واقعی ضرورت پیش آجائے اور طبیب خاذق یہ کہے کہ اس مرض کا آخری علاج داغنا ہی ہے تو پھر داغنا جائز ہو گا۔ فقط واللہ اعلم[2]

دوا کی مناسب مقدار کی رعایت

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ: أَنَّ رَجُلًا أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: أَخِي يَشْتَكِي بَطْنَهُ، فَقَالَ: «اسْقِهِ عَسَلًا» ثُمَّ أَتَى الثَّانِيَةَ، فَقَالَ: «اسْقِهِ عَسَلًا» ثُمَّ أَتَاهُ الثَّالِثَةَ فَقَالَ: «اسْقِهِ عَسَلًا» ثُمَّ أَتَاهُ

۱۔کشف الباری، کتاب الطب :۵۴۱

۲۔ دارالافتاء : جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن،فتوی نمبر:144501100603

فَقَالَ: قَدْ فَعَلْتُ؟ فَقَالَ: «صَدَقَ اللَّهُ، وَكَذَبَ بَطْنُ أَخِيكَ، اسْقِهِ عَسَلًا» فَسَقَاهُ فَبَرَأَ[1]

دوا کے مضر اثرات (Side-effects) سے آگاہی

موجودہ دور میں دوائیوں کی ایک کثیر تعداد ہے۔ان میں کچھ عمومی نوعیت کی اور بعض دوائیاں خصوصی نوعیت کی ہیں۔ان میں بعض دواؤں کے فوائد کے ساتھ کچھ خفیف سے مضر اثرات بھی ہوتے ہیں۔دوا تجویز کرنے والے معالج کے لئے اس کے مضر اثرات سے واقفیت بھی ضروری ہے۔علاج اور دوا سے جہالت یا کم علمی کی صورت میں علاج کرنا جائز نہیں اور اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

مَن تطبَّب ولم يُعلم منه طِبٌّ قبل ذلك فهو ضامنٌ [2]

ترجمہ: جو شخص اپنے آپ کو طبیب ظاہر کر کے علاج کرے، حالاں کہ اس سے پہلے اس کا طبیب ہونا معلوم نہ ہو (یعنی وہ فنِ طب کی مہارت میں مشہور نہ ہو اور علاج کرے، پھر اس کے علاج سے مریض کا کوئی عضو تلف ہو جائے، یا اس کا انتقال ہو جائے) تو وہ (مریض کا) ضامن ہو گا۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ علاج کرنے والے شخص کے پاس متعلقہ طبی معلومات ہونا ضروری ہیں۔طبیبِ جاہل کے علاج کے نتیجے میں مریض کو لاحق ہونے والے ضرر کی ذمہ داری اسی طبیب پر عائد ہو گی۔لہٰذا علاج کرنے والے شخص کا صحیح معلومات رکھنا اور ماہر ہونا ضروری ہے۔اگر وہ ایسا نہیں ہے تو اسے علاج کرنے سے رک جانا ضروری ہے۔چونکہ دوا کے مضر اثرات اور مخالف علامت نہ جاننے کی صورت میں بھی مریض کے نقصان ہونے کا قوی اندیشہ ہے لہٰذا ان دونوں باتوں سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

۱۔ صحیح البخاری،کتاب الطب،باب الدواءبالعسل،رقم ۵٦٨۴

۲۔ سنن ابن ماجه، کتاب الطب، باب من تطبب ولم يعلم منه طب،۳۴٦٦

مولانا عبد الرشید نعمانی رحمہ اللہ کے بعض کتب پر مفید قلمی حواشی و تعلیقات

محمد محسن کمبوہ

مولانا نعمانی رحمہ اللہ بھی دیگر اہل علم کی طرح کتب کے مطالعہ و مراجعت کے وقت اُن پر مفید حواشی اور تعلیقات لکھ لیا کرتے تھے، جو کہ علمی و تحقیقی شان کے اعتبار سے نہایت بلند ہوا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی بلندی اور رفعت کے سبب انہیں متعلقہ مقامات سے علمی و تحقیقی وراثت سمجھتے ہوئے اپنی دسترس کے مطابق یہاں پیش کر رہے ہیں، ان قلمی حواشی سے پہلے مولانا نعمانیؒ کے حالات مختصراً پیش خدمت ہیں:

مولانا نعمانی رحمہ اللہ کا مختصر تعارف:

مکمل نام: محمد عبد الرشید نعمانی بن محمد عبد الرحیم خاطر بن محمد بخش بن بلاقی بن چراغ محمد بن ہمت۔

پیدائش: ۱۸/ ذیقعدہ/ ۱۳۳۳ھ بمطابق ۲۹/ ستمبر/ ۱۹۱۵ء۔

آبائی وطن: جے پور، راجستان۔

ابتدائی تعلیم: حافظ محمد عبد الکریم صاحب رحمہ اللہ (جو کہ مولانا رحمہ اللہ کے عم بزرگوار تھے) سے حاصل کی، درج ذیل چیزیں حضرت رحمہ اللہ نے اپنے چچا سے پڑھیں: (۱) بسم اللہ سے ابتداء فرمائی، (۲) قاعدہ بغدادی، (۳) قرآن مجید، (۴) اردو کی درسی کتب، فارسی کے کچھ اسباق اپنے والد صاحب رحمہ اللہ سے پڑھے۔

مکمل تعلیم: مدرسہ تعلیم الاسلام میں جون ۱۹۲۸ء سے جب آپ کی عمر صرف ۱۳ سال تھی عربی پڑھنی شروع کی، اور مولانا قدیر بخش بدایونی رحمہ اللہ (۱۹۵۶ء) سے میزان منشعب تا بخاری کے ابتدائی اسباق تک درس نظامی کی تمام مروجہ کتابیں پڑھیں، مئی ۱۹۳۳ء میں کامل پانچ سال محنت کر کے مولانا بدایونی رحمہ اللہ سے سند فراغت حاصل کی، اور اسی سال پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔

ابتدائی تدریس: مدرسہ اشاعت العلوم بریلی میں فارس کے استاذ مقرر ہوئے۔

دوبارہ تعلیم حدیث: بعد ازاں مولانا رحمہ اللہ بریلی سے واپس جے پور تشریف لائے اور دار العلوم ندوہ میں

شیخ الحدیث حیدر حسن خان ٹونکی رحمہ اللہ سے حدیث پڑھی، اور ۱۹۳۵ء میں فارغ ہو کر جے پور تشریف لے آئے۔

تصنیفی کام کی ابتداء: ۱۹۳۸ء میں کتاب « معجم المصنفین » کی تدوین و تالیف میں علامہ محمود حسن خان ٹونکی رحمہ اللہ کی زیر نگرانی چار سال تک حصہ لیا۔

ندوۃ المصنفین سے وابستگی اور مستقل تصانیف کا آغاز: ۱۹۴۲ء کی ابتداء میں ندوۃ المصنفین کے رفیق مقرر ہوئے اور لغات القرآن جیسی معرکہ آرا کتاب تصنیف کی، اور ۱۹۴۷ء تک اسی ادارہ سے وابستہ رہے، بعد ازاں مختلف علمی موضوعات پر مختلف اوقات میں ۱۲ علمی و تحقیقی کتب قلمبند فرمائیں، اور کئی کتب پر گراں قدر مقدمات وغیرہ بھی قلمبند فرمائے۔

دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈوالہ یار سے وابستگی: بعد ازاں پاکستان ہجرت کر لینے کے بعد دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈوالہ یار سے وابستہ ہو گئے اور دو سال تک تدریسی خدمات سرانجام دیں۔

جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن سے وابستگی اور تدریسی خدمات: جب مولانا بنوری رحمہ اللہ نے کراچی میں جامعہ قائم فرمایا تو ان کی درخواست پر ۱۹۵۵ء میں یہاں تشریف لے آئے، اور یہاں صحیح بخاری کے علاوہ تمام متداول کتب حدیث پڑھائیں۔

جامعہ اسلامیہ بھاولپور سے وابستگی: ۱۹۶۳ء میں جامعہ اسلامیہ بھاولپور میں بحیثیت ریڈر مامور ہوئے اور ۱۳ سال تک حدیث واصول حدیث کے درس میں مشغول رہے۔

دوبارہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن سے وابستگی: ۱۹۷۶ء میں جامعہ اسلامیہ بھاولپور سے سبکدوش ہو کر کراچی آ گئے اور پھر جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں درس حدیث کی خدمت پر مامور ہوئے، اور شعبہ تخصص فی علوم الحدیث کے نگران مقرر ہوئے، اور جامعہ کے ترجمان ماہنامہ بینات کے مدیرِ اوّل بھی رہے۔

انتقال پُر ملال: بروز پنجشنبہ ۲۹ / ربیع الآخر / ۱۴۲۰ھ بمطابق ۱۲ / اگست ۱۹۹۹ء کراچی پاکستان میں رحلت فرمائی اور علمی حلقوں میں وہ خلا چھوڑ گئے جس کا پُر ہونا آسان نہیں۔

(تلخیص از ترجمہ نعمانی رحمہ اللہ بقلم ڈاکٹر محمد عبد المقیت شاکر علیمی، رسالہ اُویسیہ (ص:۱۰۶ تا ۱۱۶) ط / زیب ادبی مرکز حیدرآباد سندھ، یادوں کے چراغ از مولانا سید رابع حسنی ندوی (ص:۱۲۵) ط / مکتبۃ الشباب العلمیہ لکھنؤ)

مولانا نعمانی رحمہ اللہ کے قلمی حواشی وتعلیقات:

(۱) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تھذیب التھذیب میں عبید اللہ بن عمر بن حفص کے ترجمہ میں لکھا کہ:

«أحد الفقهاء السبعة»(١)، توعلامہ نعمانی رحمہ اللہ نے اس پر اپنے قلم سے تنقیدی وتوضیحی نوٹ لکھاہے، جو کہ مجلس دعوت و تحقیق کی لائبریری میں کتب رجال کے خانہ میں کتاب نمبر (٩٦٦٨) کی جلد نمبر (۷) کے پہلے اندرونی خالی صفحے پر اب بھی محفوظ ہے، وہ نوٹ پیش خدمت ہے:

"عبيد الله بن عمر بن حفص ... أحد الفقهاء السبعة، كذا وقع وهو خطأ،ولم يقله المزي في التهذيب، والذي يعد في الفقهاء السبعة هو عبيد الله بن عتبة بن مسعود الهذلي . النعماني"

ترجمہ: عبید اللہ بن عمر بن حفص... جو کہ فقہاء سبعہ میں کے ایک ہیں، جیسا یہ (لکھنے میں) واقع ہوا وہ غلط ہے، اور مِزّی نے تہذیب (تہذیب الکمال) میں ایسا نہیں کہا ہے، اور جو شخصیت فقہاء سبعہ میں شمار کی جاتی ہیں وہ توعبید اللہ بن عتبۃ بن مسعود ہذلی ہیں۔ نعمانی

(۲) مولانا نعمانی رمہ اللہ نے اپنے مقالہ «کتب خانہ مدرسہ عربیہ مظہر العلوم کراچی کے مخطوطات» میں ایک مقام پر مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کے ایک عبارت کی تغلیط کچھ اس انداز میں کر رہے ہیں کہ: " مولانا سندھی نے مخدوم محمد معین کو مخدوم محمد ہاشم اور ان کے صاحبزادے عبد اللہ کا استاذ بتایاہے اور اسی طرح حضرت مولانا یوسف صاحب بنوری نے بھی تکملہ و تذییل نصب الرایۃ میں ملا معین کے متعلق لکھاہے: ومن كبار شيوخ الشيخ هاشم (ص:۴۶)، اور (مولانا سندھی نے) عبد اللہ مذکور ہی کو «ذب الذبابات» کا مصنف بیان کیا ہے، لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں، مخدوم محمد ہاشم کے صاحبزادے کا نام عبد اللہ نہیں عبد اللطیف ہے، اور ملا معین مخدوم محمد ہاشم کے استاذ نہیں شاگرد ہیں،، [۲]۔

لیکن جب یہ مقالہ ماہنامہ دعوۃ الحق میں چھپ کر آگیا تو حضرت رحمہ اللہ نے دوبارہ اس کا مطالعہ فرماتے ہوئے اپنی ملا معین کو مخدوم محمد ہاشم کا استاذ بتانے والی تغلیط سے رجوع فرمایا اور وہیں اپنے قلم سے رجوعی کلمات تحریر فرمادیے جو ہمارے ہاں جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے رسالوں کے حصے میں مذکورہ رسالہ میں متعلقہ مقام پر محفوظ ہیں، رجوعی تحریر ملاحظہ فرمائیں:

---

١) تهذيب التهذيب (٣٧/٧)، ترجمة عبيد الله بن عمر بن حفص، رقم الترجمة (٧١)، ط/مجلس دائرة المعارف النظامية الهند سنة ١٣٢٦هـ

۲) کتب خانہ مدرسہ عربیہ مظہر العلوم کراچی کے مخطوطات، (ص: ۷۲)، قسط نمبر (۱)، تعارفی نمبر (۱۱)، ماہنامہ دعوۃ الحق، بابات: رمضان وشوال سنہ ۱۳۷۱ھ۔

"بعد کو مخدوم محمد ہاشم کا رسالہ «کشف الغطاء(۱)» مطالعہ میں آیا جو مخدوم معین کے رسالہ «قُرّۃ العیون» کا جواب ہے، اس میں مخدوم محمد ہاشم نے مصنف رسالہ کو اپنا شیخ بتایا ہے"۔

(۳) مولوی رحمن علی صاحب کی کتاب «تذکرہ علماء ہند» کا اردو ترجمہ جو محترم جناب محمد ایوب قادری نے کیا تھا، جسے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے شائع کیا تھا، اس پر مولانا نعمانی رحمہ اللہ کے قلم سے کتاب کے لیے تعارفی کلمات شروع میں لکھے گئے تھے، تو جب وہ ترجمہ شائع ہو کر مولانا کے پاس پہنچا تو مولانا رحمہ اللہ نے اس میں آخری پیراگراف سے قبل ایک پانچ سطری پیراگراف کو قلم سے نشان زد کر کے اس پر وضاحتی نوٹ لکھا ہے کہ یہ پیراگراف میرا نہیں ہے کسی نے اسے یہاں داخل کر دیا ہے، مولانا کا یہ وضاحتی نوٹ مجلس دعوت و تحقیق کے کتب خانہ میں طبع شدہ مذکورہ کتاب پر اور علیحدہ سے ایک خط جو ادارے کو متنبہ کرنے کے لیے لکھا گیا دونوں صورتوں میں موجود ہے، خط میں لکھا گیا مولانا رحمہ اللہ کا وضاحتی نوٹ ملاحظہ فرمایئے:

"یہ مداحی ایوب قادریؒ کے قلم کی ہے، میری نہیں، عنایت ہو جو اس کو بھی حذف کر دیا جائے"۔

اور مطبوعہ کتاب میں مقررہ پیراگراف کی نشان زدگی کے بعد حضرت رحمہ اللہ کا نوٹ کچھ یوں ہے:

"یہ سطریں الحاقی ہیں، میرے قلم سے نہیں۔ محمد عبد الرشید نعمانی، ۲۵/ربیع الثانی/۱۴۰۹ھ"۔

(۴) مولانا نعمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"خود ہم نے اس (کتاب الآثار بروایت امام محمد) کے رجال پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے، اور اس نسخہ کی احادیث کو مسانید صحابہ پر مرتب کیا ہے"۔(۲)

لیکن یہ کتاب الآثار کے رجال پر جو کام حضرت رحمہ اللہ نے کیا وہ مکمل کہاں ہے اس بارے جب ہم نے مولانا نعمانی رحمہ اللہ اور استاذِ مکرم مولانا عبد الحلیم چشتی صاحب رحمہ اللہ کے متعلقہ قریبی حضرات سے معلومات حاصل کرنا شروع کیں تو ہمیں مولانا عابد لاہوری صاحب (صفہ اکیڈمی والے) نے بتاریخ ۷/ربیع الثانی/۱۴۴۲ ہجری بذریعہ واٹسپ پیغام بتلایا کہ:

"حضرت مولانا نعمانی رحمہ اللہ نے کتاب الآثار کے رجال پر کچھ کام کیا تھا تکمیل کا موقع نہیں ملا، اور مسودہ بھی کہیں کاغذات میں گم ہے، ابھی تک ملا نہیں، دعا فرمائیں"۔

البتہ کتاب الآثار بروایت امام محمد کے متعلق مولانا نعمانی رحمہ اللہ کی قلمی کاوشوں میں ہمیں بعض

---

۱) اس رسالہ کا مکمل نام یہ ہے: کشف الغطاء عما یحلّ ویحرم من النوح والبکاء۔
۲) مقدمہ کتاب الآثار (ص:۲۱)، ط/الرحیم اکیڈمی۔

مقامات پر تخریج احادیث کے بھی بعض قلمی حواشی ونوٹس ملے ہیں، جو کہ بعد کو مولانا رحمہ اللہ کے برادر جناب مظفر لطیف صاحب کی جانب سے اپنے مکتبہ "مکتبہ اہل سنۃ وجماعۃ کراچی" سے طبع کردہ کتاب الآثار بروایت امام محمد کے (ص:۱۰اوا۱) پر قلمی حواشی کی صورت میں طبع بھی ہوئے ہیں۔

مولانا نعمانی رحمہ اللہ کے کتاب الآثار بروایت امام محمد پر وہی قلمی تخریجی حواشی ملاحظہ فرمائیے:

مولانا رحمہ اللہ حدیثِ اَبو سعید خدری رضی اللہ عنہ: >الوضوء مفتاح الصلاة، والتكبير تحريمها، والتسليم تحليلها، ولا تجزئ صلاة إلا بفاتحة الكتاب ومعها غيرها، وفي كل ركعتين فسلّم يعني فتشهد< کی تخریج فرماتے ہوئے حاشیہ میں رقمطراز ہیں:

"وأخرجه الدارقطني في سننه (ص:١٤٠) فقال: حدثنا عبد الله بن أبي داود ثنا اسحاق بن إبراهيم بن شاذان ثنا سعد بن الصلت ح وحدثنا ابن أبي داود ثنا عبد الرحمن بن الحسين الهروي ثنا المقرئ قالا نا أبو حنيفة عن أبي سفيان به.

وأخرجه البيهقي في السنن الكبرى (٣٨٠/٢) فقال: انبأ على بن أحمد بن عبدان حدثنا أحمد بن عبيد الصفار حدثنا بشر بن موسى حدثنا أبو عبد الرحمن يعنى المقرئ عن أبى حنيفة به.

وأخرجه في كتاب القراءة خلف الإمام أيضًا (ص:١٣)".

اور امام محمد رحمہ اللہ کے ذکر کردہ بلاغ: >وبلغنا أن ابن عباس رضي الله عنه سئل عن القراءة في الصلاة فقال: هو امامك إن شئت فاقلل منه، وإن شئت فأكثر< پر حاشیہ میں تخریج فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قلت هذا البلاغ قد وصله ابن أبي شيبة في مصنفه حيث قال: حدثنا ابن علية عن أيوب عن أبي العالية البراء به (٣٦١/١)".

(۵) مجلس دعوت وتحقیق کے کتب خانہ میں شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب «تحریر الشھادتین» جو کہ کتب تاریخ کے خانہ میں قدیم رقم نمبر کے اعتبار سے (۲۷۷۷) نمبر پر موجود ہے، اس کے اندرونی سرورق پر ایک صاحب کی فارسی تحریر درج ہے کہ:

"نسبت ایں رسالہ بہ شاہ عبد العزیز دھلویؒ قطعا کذب وافتراء ومزیّن ساختن خرافات است"

ترجمہ: اس رسالہ کی نسبت شاہ عبد العزیز دہلوی رحمہ اللہ کی طرف یقینی طور پر جھوٹ اور افتراء ہے، اور خرافات کو مزین کرکے پیش کرنا ہے۔

تو اس تحریر پر ساتھ ہی علامہ نعمانی رحمہ اللہ نے فارسی ہی میں تنقیدی وتوضیحی نوٹ لکھا ہے جو کہ مذکورہ

کتاب کے رقم نمبر پر مجلس دعوت و تحقیق میں اب بھی محفوظ ہے، وہ فارسی تنقیدی و توضیحی نوٹ پیش خدمت ہے: ”ایں تحریر یکے از نواصب است کہ افتراء و کذب شیوہ بزرگان اوست۔ خذلہ اللہ

چرا کہ نسبت ایں رسالہ بہ شاہ صاحب ممدوح علیہ الرحمۃ بتواتر رسیدہ۔ نعمانی“

ترجمہ: یہ تحریر ایک ناصبی کی تحریر ہے کہ جھوٹ اور افتراء انہیں کے بزرگوں کا شیوہ ہے، اللہ اسے رسوا کرے۔

اس لیے کہ اس رسالہ کی شاہ صاحب ممدوح علیہ الرحمۃ کی طرف نسبت تواتر کی حد کو پہنچی ہوئی ہے۔

مولانا نعمانی رحمہ اللہ کے یہ چند قلمی حواشی دیکھ لینے کے بعد جہاں مولانا رحمہ اللہ کی علمی جلالت شان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے وہیں مولانا رحمہ اللہ کے اس تحقیقی و علمی طرز عمل کو اپنانے کا سبق بھی ملتا ہے کہ دوران مطالعہ تحقیق کا دامن ہاتھ سے ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیے، مفید چیزیں بعد از تحقیق اپنے پاس قلمی نوٹس کی صورت میں محفوظ کر لینی چاہیے ہیں۔

اللہ مولانا نعمانی رحمہ اللہ کی قبر مبارک کو نور سے بھر دے۔ آمین

مصحفِ صنعا اور تحریفِ قرآن کا دعویٰ!

ابو الحسین آزاد

[کچھ دن قبل سوشل میڈیا پر مشہور ملحد مبشر زیدی نے قرآن مجید کے نسخہ صنعاکی بنیاد پر قرآن مجید کی تحریف کا بے بنیاد دعویٰ کیا، چونکہ یہ ملحد اپنے مسلکی پس منظر میں بھی تحریف قرآن کا عقیدہ رکھتاہے ، لہذا اس پر کئی احباب کے سوالات موصول ہوئے کہ مبشر زیدی کی اٹھائی ہوئی اس بے ہودہ بحث میں فیصلہ کن بات کیا ہے ؟ذیل میں ہم ایک معاصر عالم دین کا مضمون پیش کر رہے ہیں ، جس سے مصحف صنعاکا پس منظر اور اس بنیاد پر تحریف قرآن کا کھوکھلا نظریہ بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ادارہ]

قصے کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا دعوتی مکتوب کسریٰ کے پاس پہنچا تو اُس نے غصے سے اُسے چاک کر دیا اور یمن میں اپنے گورنر باذان کو حکم دیا کہ اِس مدعیِ نبوت کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیجو۔ باذان کے قاصد رسول اکرم ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ ﷺ نے اُنھیں اطلاع دی کہ کسریٰ کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ دونوں واپس باذان کے پاس چلے گئے، اس واقعے کے کچھ دنوں بعد باذان اور یمن کے دیگر بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ نبی کریم ﷺ نے اُن کے پاس حضرت معاذ بن جبلؓ کو تعلیم کے لیے بھی بھیجا اور اُنھیں صنعاء شہر میں باذان کے باغیچے میں ایک مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ نبی علیہ السلام نے اُس مسجد کے قبلے کا رُخ بھی بتایا کہ اسے ضین نامی پہاڑ کی طرف رکھنا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آج سیٹلاٹ سے اُس مسجد کی محراب اور ضین پہاڑ سے گزرتا ہوا مستقیم خط کھینچا جائے تو وہ سیدھا کعبہ کے وسط میں پہنچتا ہے۔

بہر حال صنعاء کی یہ مسجد الجامع الکبیر صنعاء کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۶۵ء میں یہاں شدید بارشیں ہوئیں جس کی وجہ سے مسجد کی چھت ایک جگہ سے گر گئی۔ مرمت کے لیے چھت کو مزید کھولا گیا تو نچلی چھت اور اوپر والی چھت کے درمیان ایک کمرہ سا تھا جس سے ہزاروں کی تعداد میں مخطوطات اور صحیفے نیچے گر پڑے۔ یہ کوئی ۴۵۰۰ کے قریب قرآنی نسخے تھے جو مختلف صدیوں کے دوران لکھے گئے تھے۔ غالبا اِن میں سے جو جو نسخے قدرے بوسیدہ یا شہید ہوتے گئے اُنھیں مسجد کی چھت میں جمع کیا جاتا رہا ہو گا۔ بہر حال اِس واقعے کے بعد مغرب سے بہت سی ٹیمیں اِن مصاحف کے مطالعے کے لیے پہنچیں اور جرمنی نے بھاری سرمایہ خرچ کر کے

محققین کو کام پر لگایا۔ اِن نسخوں میں سے ایک انتہائی پرانا نسخہ بھی نکلا جس کے متعلق کاربن ڈیٹنگ سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ یہ پہلی صدی ہجری کا ہو گا۔

چمڑے کے کاغذ پہ لکھا گیا یہ مصحف جسے مصحفِ صنعا یا مخطوطۂ صنعا کہا جاتا ہے اِس کی دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں دوہری تحریر لکھی گئی ہے۔ نیچے ایک تحریر ہے جسے مٹا کر اوپر دوسری تحریر لکھی ہوئی ہے البتہ نیچے والی تحریر کو بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اوپر والی تحریر تو قرآن کے موجودہ نسخوں کے مطابق ہے البتہ نچلی تحریر میں سو سے کچھ اوپر مقامات میں بعض کلمات مختلف انداز میں لکھے گئے ہیں۔ یہ اختلاف ایسا نہیں جس سے معنی میں فرق پڑے بلکہ و، ف، علیہ، فیہ، ذلک، کذلک اور اسی طرح بعض مترادف الفاظ کے اختلافات ہیں۔ چوں کہ پہلے پہل اس مصحف تک مستشرقین کی رسائی ہوئی چناں چہ مشنری اور تنصیری حلقوں نے اِس پر بہت واویلا مچایا کہ قرآن کا ایک ایسا نسخہ ملا ہے جو کہ موجودہ قرآن سے مختلف ہے۔ جسے بعد میں کسی نے موجودہ قرآن کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے لہٰذا مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ قرآن محفوظ ہے درست نہیں، ماضی کا قرآن اور تھا اور آج کا قرآن اور ہے۔

اس پروپیگنڈے کے بعد یہ مخطوطہ دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بن گیا اور بہت سے مستشرقین نے اِسے تحقیق کا موضوع بنایا۔ ازاں بعد یہ مکمل چھپ کر بھی سامنے آ گیا۔ ایک ستم ظریفی یہ بھی دیکھیے کہ مغربی تحقیقی ٹیموں کے برعکس جب ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی اِس نسخے پر کام کرنے صنعاء گئے تو اُنھیں صرف دو اوراق ہی دکھائے گئے، بقیہ مصحف تک رسائی نہیں دی گئی۔

فرانس کی ایک جامعہ کی طرف سے تحقیق پر مامور ڈاکٹر اسماء ہلالی نے اِس موضوع پر آرٹیکل چھاپا اور با قاعدہ کتاب بھی تصنیف کی۔ اُن کے بعد ڈاکٹر سامی عامری نے بھی اِس پر تفصیل سے کام کیا اور اُن تمام مستشرقین اور مسلم محققین سے ملاقاتیں کیں جنھوں نے اِس نسخے پہ کام کیا تھا۔ ڈاکٹر عامری نے طویل ریسرچ کے بعد اس پہ مضمون بھی لکھا اور یوٹیوب پر تفصیلی ویڈیو بھی اپلوڈ کی۔

اِن دونوں محققین کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ یہ مصحف دراصل ایک مشقی کاپی تھی جس پر قرن اول کا کوئی بچہ قرآن کا سبق لکھ کر اُسے یاد کرتا تھا۔ اب جہاں کہیں اس بچے سے غلطی ہو جاتی وہ اسے صاف کر کے دوبارہ اوپر درست لفظ لکھ دیا کرتا تھا۔ اپنے موقف کی تائید میں ڈاکٹر اسماء ہلالی مندرجہ ذیل دلائل دیتی ہیں:

ا۔ آیات کی عبارتیں آڑھی ترچھی لکھی گئی ہیں، بعض سطروں میں کم الفاظ ہیں بعض میں قدرے زیادہ، اسی طرح خط بھی پختہ یا معیاری نہیں ہے۔ ظاہری سی بات ہے اُس زمانے میں چمڑے کا کاغذ لے کر اُس پہ مصحف لکھوانے کے لیے بھاری سرمایہ درکار ہوتا تھا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی اتنا سرمایہ لگا کر ایسا غیر متوازن نسخہ تیار کروائے۔ نیز اس نسخے کی ہیئت بھی ویسی ہے جیسی اُس عہد کی تدریسی کاپیوں کے متعلق خیال کی جا سکتی ہے۔

۲۔ نچلی عبارتوں میں پائے جانے والے اکثر و بیشتر اختلافات ایسے ہیں جو حفاظ کے متشابہات قسم کے ہیں۔ عربی زبان جاننے کی وجہ سے لکھنے والے نے کئی جگہوں پر قرآن میں مذکور لفظ کی جگہ اُسی کا ہم معنی لفظ لکھ دیا ہے۔ مثلاً سورہ مریم کی آیت لم نجعل له من قبل سميا کو لم نجعل له من قبل شبيها لکھ دیا ہے اور بعد میں شبیها کو مٹا کر اصلاح کر دی ہے، اسی طرح أو الطفل الذين لم يظهروا کو اُس نے أو الولدان الذين لکھ دیا۔ پھر درست کر کے ولدان کو آدھا مٹا کر وہاں طفل لکھ دیا ہے جس سے یہ کلمہ اوالول الطفل بن گیا ہے۔

۳۔ بعض جگہ نحوی املائی غلطیاں ہیں جیسے ولم يخشَ کو ولام يخشَ اور أولا يرون کو أولا يرو لکھ دیا ہے۔ جو ظاہری سی بات ہے کوئی بڑی عمر کا عربی جاننے والا نہیں لکھ سکتا۔ اسی طرح وجاهد في سبيل ال له لکھ کر نچلی آیت کے وجاهدوا في سبيل الله سے متشابہ لگنے پر یہاں واحد غائب کے مقام پر بھی وجاهد اور في کے متوازن فاصلے کے درمیان "و" کو گھسیڑ دیا ہے۔

۴۔ سب سے دل چسپ بات یہ ہے کہ اس مصحف میں سورہ توبہ کے شروع میں بھی بسم اللہ لکھی ہوئی ہے لیکن پھر اوپر لکھا ہے: لا تقل بسم الله یعنی بسم اللہ نہ کہو۔ یہ اِس بات کی واضح علامت ہے کہ یہ ایک درسی کاپی ہے جو کسی استاذ کے زیرِ نگرانی لکھی جاتی تھی اور اُستاد اُس میں پائی جانے والی اغلاط کی تصحیح کرا دیا کرتا تھا۔

۵۔ بعض جگہ فقرے کی ترتیب کو قدرے بدل دیا گیا ہے جیسے قد شغفها حبا کو قد شغفها حبٌّ فتاها لکھ دیا گیا ہے۔

الغرض سو سے کچھ اوپر کی یہ تمام اغلاط انتہائی معمولی نوعیت کی ہیں جن سے معنی پر کوئی فرق نہیں پڑتا اور اُن سب کی اصلاح بھی مصحف پر موجود ہے۔

قرآن کوئی قدیم زمانے کے پتھر پہ لکھا ہوا نقش نہیں جو اچانک سے آج دریافت ہو گیا ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جو پیغمبر ﷺ کی زندگی ہی میں ہزاروں لوگوں نے حفظ کر لی تھی، دن رات نمازوں میں پڑھی جاتی تھی، اس کے لکھے ہوئے نسخے مسلمانوں کے گھروں میں ہوتے تھے۔ حتی کہ حضرت عمر کے قبولِ اسلام کے واقعہ، جس میں اُن کی بہن دیکھ کر قرآن کی تلاوت کر رہی تھیں، سے معلوم ہوتا ہے کہ مکی عہد میں بھی مسلمان جو جو آیات نازل ہوتی جاتی تھیں، لکھ کر گھر گھر اُس کے نسخے رکھ لیا کرتے تھے۔ لہذا ایک دو نہیں اگر بیسیوں نسخے بھی ایسے مل جائیں جن میں بعض اختلافات ہوں تو اس سے قرآن کی صحت اور استناد پہ کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ لیکن اسے عقل و خرد کا زوال ہی کہیے کہ ایک بچے کی مشقی کاپی کی چند معمولی اغلاط استشراق، تنصیر اور الحاد کے لیے ایسا ڈھول بن گئی ہیں جیسے تین دہائیوں سے پیٹ پیٹ کر وہ پھولے نہیں سما رہے۔

تجددپسندی سے الحاد تک (ایک قصہ)

ڈاکٹر حسیب احمد خان

یہ ان دنوں کا قصہ ہے کہ میں نے انٹر کا امتحان پاس کیا تھا، بی کام کر رہا تھا، ایک طرف تو نوکری کی تلاش تھی تو دوسری جانب کتابوں کا شوق ۔ اس لیے بہت سا وقت لائبریریوں میں گزرتا تھا، یہ وہ دور تھا کہ جب میں نے متعدد کتب کا مطالعہ کیا، اردو ادب سے انگریزی ادب اور خاص کر دینی علوم سے متعلق بے شمار کتب اسی دور میں پڑھیں، ساتھ ہی ساتھ تبلیغی جماعت کے ساتھ بھی وقت لگتا رہا اور کچھ ادبی حلقوں میں بھی بیٹھک شروع ہوئی، انہی دنوں مختلف مکاتب فکر کے دینی اداروں اور مراکز میں جانے کا سلسلہ بھی رہا اور مطالعہ کے ساتھ ساتھ مباحث اور مکالمے کا شعور بھی پیدا ہوا، اس زمانے میں ہم لوگ نئے نئے نارتھ کراچی منتقل ہوئے تھے وہاں پر ایک صاحب ملے اور انہوں نے مذہب کی ایک مختلف تعبیر رکھنے والے گروہ سے متعارف کروایا، اس زمانے تک میں روایتی مذہبی طبقات سے بخوبی واقف تھا، ذاتی حیثیت میں دیوبند مکتب فکر سے منسک تھا (الحمد للہ آج بھی ہوں) لیکن دیگر روایتی مسالک کے لوگوں سے ضرور واقفیت رہتی تھی، خاص کر میرے حلقے میں بہت سے بریلوی اور اہل حدیث احباب بھی موجود تھے۔ اسی طرح چونکہ میں نے جماعت اسلامی کے اسکول سے پڑھا تھا تو جماعتی حلقوں میں بھی آنا جانا تھا، دوسری جانب ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم سے چونکہ میرے بڑوں کے خاندانی تعلقات رہے تھے، وہ میرے دادا کے بڑے بھائی مولانا برکات احمد خانؒ کے شاگرد تھے اور حصار میں میرے نانا ظہور احمد خان صاحبؒ کے ہم مکتب تھے، اس لیے تنظیم کے حلقوں سے بھی بخوبی واقفیت تھی، سو ان تمام طبقات میں جانا رہتا تھا، لیکن میں ذکر کر رہا ہوں ایک نئی تعبیر رکھنے والوں کا ، تو نارتھ کراچی میں ایک صاحب سے تعلق ہوا اور انہوں نے مجھے اس جدید تعبیر سے متعارف کروایا، اس خاص اس عنوان پر ان سے مباحث کا سلسلہ شروع ہو گیا جب وہ صاحب مجھے کسی بھی انداز میں قائل کرنے میں ناکام رہے تو انہوں نے مجھے دعوت دی کہ آپ ہمارے ساتھ ہمارے مرکز چلیں تو ایک دن میں ان کے ساتھ ان کے مرکز بہادر آباد "دانش سرا" کراچی چلا گیا، وہاں پر ان کے ایک بڑے مفکر کا بیان تھا اور میں پہلی بار انہیں سن رہا تھا، مجھے بتایا یہ گیا کہ موصوف بہت بڑی علمی شخصیت ہیں اور اس دور میں دین کا ایک بڑا کام کر رہے ہیں، اسی مرکز میں میری ملاقات

ایک نوجوان عالم سے بھی کروائی گئی اور انکی بابت یہ معلوم ہوا کہ بنوری ٹاؤن کے فاضل ہیں اور دیوبندیت سے تائب ہو کر ان مجدد صاحب کے حلقہ دام میں الجھ بیٹھے ہیں۔ موصوف کو اپنے ایک بزرگ مفتی ولی حسن ٹونکیؒ کا حوالہ دیا کہ جو اپنے دور کے ایک بڑے دیوبندی عالم گزرے ہیں تو موصوف انہیں پہچان گئے، میں نے ان سے سوال کیا کہ آپ کے اندر اتنی بڑی فکری تبدیلی کیسے آئی؟ تو کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے، بہر حال اس دن ان بڑے تجدد پسند صاحب کا لیکچر سنا اور بہت سی باتوں کے متعلق ابہام اور تشویش پیدا ہوئی، ایک موقع پر اپنی عادت سے مجبور ہو کر میں نے ان سے دو سوال پوچھے۔

پہلا سوال: آپ کا مروجہ درس نظامی سے متعلق کیا خیال ہے؟

اس پر موصوف نے فرمایا کہ یہ ایک مردہ ہے جسے دفنا دینا چاہیے اور اس کی یادگار کو کسی میوزیم میں رکھ دینا چاہیے۔

دوسرا سوال: آپ کے کام کا حقیقی مقصود کیا ہے؟

اس پر موصوف نے فرمایا کہ دین کی وہ روایت جو پچھلے ساڑھے تیرہ سو سال سے پوشیدہ ہے، ہم اس کو سامنے لا کر دین کی تشکیل نو کرنا چاہتے ہیں۔

ان دو جوابات سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ موصوف کا قبلہ درست نہیں ہے، بہر حال موصوف کے کچھ ریکارڈڈ بیانات کہ جو انہی کے ادارے سے آڈیو کیسٹ کی شکل میں مل گئے اور "میزان" نامی کتاب ہاتھ آئی کہ جس کا مطالعہ کیا اور اسی دور میں میرے اندر اس تجدد پسند گروہ کی مخالفت کا جذبہ پیدا ہوا اور مجھے اسی گروہ کی مخالفت نے روایت اور روایت پسند حلقوں سے قریب تر کر دیا، اس رویے کی وجہ کیا بنی؟ اس کے پیچھے موجود کہانی آپ کے سامنے رکھتا ہوں، اس طویل لیکن ضروری تمہید پر معذرت۔

قصہ کیا ہے؟

قصہ کچھ یوں ہے کہ جو موصوف مجھے اس گروہ کی طرف لیکر گئے تھے انہوں نے اس حلقے میں جانے والے کچھ نوجوانوں سے ملاقات کروائی، اس دور میں یہ نوجوان بہادر آباد "دانش سرا" کے دورے بھی کرتے تھے اور کراچی پیالہ ہوٹل کی ایک مسجد میں بھی جاتے تھے، اس مسجد والے خود کو "مسلمین" کے نام سے متعارف کرواتے تھے (یہ معروف جماعت المسلمین کی ایک ذیلی شاخ ہے) بہر حال یہ کہانی کسی اور دن۔

وہ نوجوان سنیاروں کے خاندان سے تھے، جو صاحب مجھے لیکر گئے تھے وہ بھی دہلی پنجابی سوداگران کے سنار خاندان سے تھے، یہ وہ نوجوان تھے کہ جو ابتدائی طور پر میری طرح تبلیغی جماعت سے متاثر ہو کر دین کی طرف آئے تھے بعد ازاں دین کا مطالعہ اور علماء سے تعلق نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اندر علمی واعتقادی پختگی نہ

آ سکی اور کسی بزرگ سے تعلق نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اندر روحانی بیداری بھی پیدا نہ ہو سکی اور اپنی اسی کمی کی وجہ سے وہ اس تجدد پسند حلقے کی دام صد رنگ میں پھنستے چلے گئے۔

ان نوجوانوں سے مباحث کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا بعد ازاں ان سے تعلق قائم نہ رہ سکا اور پھر ان کے حوالے سے بعض افسوس ناک قسم کی خبریں بھی ملیں، قصہ مختصر ان کے رویے میں بتدریج تبدیلیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں اور وہ تبدیلیاں کیا تھا۔

سب سے پہلے تو انہیں یہ بتایا گیا کہ جو ٹوپی آپ کے سر پر ہے، در حقیقت یہ صرف ایک رواج ہے اور اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ جو داڑھی آپ نے رکھی ہوئی ہے یہ عرب ثقافت کا مظہر ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں اور خاص طور پر لباس کا مذہب سے کوئی لینا دینا نہیں۔

کچھ ہی عرصے میں ان کے سروں سے ٹوپیاں غائب ہو گئیں، ان کی داڑھیاں صاف ہو گئیں اور آہستہ آہستہ ان کا لباس تبدیل ہونا شروع ہو گیا، یہ وہ پہلی سیڑھی تھی کہ جو دینی روایت کی بلند و بالا عمارت سے اتر کر کسی پاتال کی طرف جاتی تھی۔

دوسرے درجے میں ان کے ذہن میں مذہبی شخصیات خاص کر علماء اور مشائخ کے حوالے سے متعدد اشکالات پیدا کیے گئے، کہیں پر انہیں مشاجرات کی بحث میں الجھایا گیا اور کہیں پر وہ اولیاء اللہ اور صوفیاء کے حوالے سے شدید ابہام کا شکار ہو گئے، یہاں پر ان کا تعلق دینی روایت سے ٹوٹنا شروع ہو چکا تھا۔

تیسرے درجے میں ان کے قلوب میں فقہ اسلامی کے حوالے سے عجیب و غریب قسم کے اشکالات پیدا کیے گئے، ابتدائی طور پر فقہی آراء کو نصوص سے متصادم قرار دیا گیا اور تقلید کو کفر کے قریب قریب شمار کروایا گیا اور انہیں ایک مخصوص علمی کتابی دین کی طرف راغب کرنے کی بات ہوئی۔

چوتھے درجے میں براہ راست احادیث مبارکہ پر ان کے اذہان میں اشکالات پیدا ہو گئے اور وہ آہستہ آہستہ حدیث نبوی ﷺ سے دوری کا شکار ہوتے چلے گئے۔

یہ وہ دور تھا کہ جب وہ نوجوان تجدد پسندوں کے اس حلقے سے نکل کر ایک دوسرے گروہ سے قریب ہوئے کہ جو "طلوع" اسلام کا پرچارک تھا اور اپنی شناخت قرآن سے بتاتا تھا اس کے بعد وہ نوجوان اس دوسرے تجدد پسند حلقے سے قریب ہونا شروع ہوئے اور آہستہ آہستہ ان کا رابطہ دینی کی روایت سے مکمل طور پر قطع ہو گیا۔

اس کے بعد پانچواں دور شروع ہوتا ہے معلوم ہوا کہ ان کے اذہان میں قرآن کریم سے متعلق بھی کچھ اشکالات پیدا ہو چکے ہیں اور اب وہ خود کو ہیومنسٹ قرار دیتے ہیں گو کہ کہ پہلے ہی ان کے اندر لبرل اور سیکولر سوچ پیدا ہو چکی تھی، لیکن عرف عام میں ہیومنسٹ ہو جانا در حقیقت الحاد کی حدود میں داخل ہو جانا تھا۔

چھٹا دور دورِ تشکیک تھا، اب ان کا ذہن خدا کی بابت بھی مشکوک ہو چلا تھا اور بہت سے سوالات ان کے ذہن میں تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ آخری درجے یعنی خالص دہریت کی سیڑھی وہ اترے یا نہیں؟ مگر یہ آخری منزل اب کچھ زیادہ دور نہیں تھی، اس کے بعد ان سے کوئی رابطہ نہ رہا۔

یہ بیس ایک سال پرانی کہانی ہے، اس دوران زندگی کے مختلف ادوار دیکھے، تعلیمی سفر طے کرتے کرتے میں پی ایچ ڈی کی سطح تک پہنچ گیا لیکن بیس ایک سال پہلے ہی میں دفاعِ دین کے ایک شعبے کا تعین کر چکا تھا، مجھے یہ بخوبی معلوم ہو چکا تھا کہ ہمارے معاشروں میں الحاد و دہریت کی راہ تجدد پسندی کے راستے سے ہموار ہوتی ہے اور مجھے اس حوالے سے کام کرنا ہے، سو آج بھی اسی شعبے کے حوالے سے محنت جاری ہے۔

آج بھی جب میں کسی نوجوان کو تجدد پسندی کے راستے پر قدم رکھتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے یہ خدشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں یہ شخص الحاد و دہریت کی پاتال میں نہ جا گرے، اسی لیے میں دینی روایت کی بہت سی ابتدائی چیزوں کے حوالے سے بھی شدید قسم کی حساسیت کا اظہار کرتا ہوں کہ جو ہمارے بعض دوستوں کو انتہائی ناگوار بھی گزرتی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ یہ حساسیت درست ہے یا نہیں؟ لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ تجدد پسندی کا یہ بیج آخرکار انسان کو دہریت کے شجرِ خبیثہ پر چڑھا دیتا ہے۔

اللہ رب العزّت ہمیں اور ہماری نوجوان نسل کو اس فتنے کے دور میں اس دور کے سب سے بڑے فتنے سے محفوظ رکھے اور نبی کریم ﷺ کی روایات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

سکرین کا نشہ اور خاندانی وسماجی زندگی پر اس کے اثرات

ڈاکٹر فہیم الدین

آج کل جبکہ چھوٹے بچے، جوان، مرد اور عورتیں، سب کے سب سمارٹ فونز اور ٹیبلٹ سکرین کے ساتھ چپکے نظر آتے ہیں اور ہر وقت موبائل میں انٹرنیٹ اور گیمز کھیلتے رہتے ہیں، جس نے با قاعدہ نشے کی شکل اختیار کی ہے۔ماہرین نفسیات سے معلومات حاصل کرنے پر یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ والدین کی اکثریت تنہائی کا شکار ہیں، اور نوعمر لڑکے لڑکیاں اپنی خیالی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ حافظے کی کمزوری کی شکایات عام ہیں۔ ذہنی دباؤ، ڈیپریشن اور خودکشیوں کے احوال سامنے آرہے ہیں۔۔ ہمارے ملک کے بحرانوں میں سے ایک عظیم بحران یہی ہے۔ زیر نظر مضمون اس بحران کے نفسیاتی، سماجی، روحانی، اخلاقی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

(سکرین کا نشہ:Screen Addiction)

ہوا یوں کہ گزشتہ دو دہائیوں سے ٹیکنالوجی میں ترقی ہوئی اور غیر محسوس انداز سے ہمارے غریب وطن کے گھر گھر اس کی رسائی ہوئی۔ ماہرین نے تو ٹیلی وژن کے بارے میں کہا تھا کہ یہ توانائی اور وقت ضائع کرنے کا آلہ ہے، لیکن ٹیلی وژن تو محدود پروگرام دکھاتی تھی، اب صورتحال یکسر مختلف ہے. اب "جام جمشید" کی طرح سکرین میں پوری دنیا سمائی ہے۔

سکرین کے نشے کے مارے تین گروہ ہیں:

۱) ایک وہ جو ڈراموں فلموں کے شوقین ہیں اور انٹرٹینمنٹ کے نام پر روزانہ نئے نئے تماشے دیکھتے ہیں۔ اب تو پورے پورے ویب سیریز ہیں جن کو سات آٹھ گھنٹوں میں راتوں رات دیکھا جاتا ہے۔

۲) دوسرے وہ لوگ ہیں جو ویڈیو گیمز کے شوقین ہوتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ کھیلنے والا خود جسمانی طور پر سب کر رہا ہے۔ اب تو آن لائن گیمز میں باقاعدہ گروپس بن جاتے ہیں حتی کہ بعض دفعہ گیم میں زیادہ سکور حاصل کرنے کے چکر میں پیسے بھی خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ ایسے لڑکے کمرے میں اکیلے بیٹھ کر آن لائن ایک دوسرے کو پاگلوں کی طرح آوازیں نکالتے ہیں۔

۳) تیسری قسم وہ جو سوشل میڈیا فیس بک، واٹس ایپ وغیرہ کا بے تحاشا استعمال کرتے ہیں۔
ہر دوسرے آدمی کے ہاتھ میں ٹچ موبائل ہے جس میں وہ منہمک رہتا ہے۔ اسی کو سکرین کا نشہ کہتے ہیں۔
میڈیا سکرین کوئی معمولی چیز نہیں بلکہ انسانی سوچ و فکر بنانے کا ذریعہ ہے۔

مذکورہ بالا حالات کے ذہنی و نفسیاتی اثرات:

۱) کتب بینی میں عدم دلچسپی:

اعلیٰ تعلیمی اداروں کی بڑی بڑی لائبریریاں اکثر خالی پڑی رہتی ہیں۔ ہاتھ میں کتاب لئے پھرنا اور چارپائی کے سرہانے کتاب رکھنے کا رواج تقریباً ختم ہو گیا۔ لوگوں کا گمان یہ ہوتا ہے کہ ہم لیپ ٹاپ اور موبائل میں مطالعہ کرتے ہیں حالانکہ سکرین میں دیکھنے سے جسمانی و ذہنی بوجھ بڑھتا ہے۔ یادداشت کی کمزوری، عدم توجہ، گردن، کمر اور پٹھوں میں تکلیف کا سبب عموماً یہی ہوتا ہے۔

۲) جدید مغربی طرز زندگی

جو انسان دیکھے گا سنے گا وہی سوچے گا۔ انسانی سوچ و فکر میں تبدیلیوں کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ اکیسویں صدی میں انتہائی سرعت سے مغربی سوچ و فکر کے یلغار سے نوجوانوں کی طرز زندگی میں بھی انقلاب آیا ہوا ہے۔ ہر لڑکا لڑکی نئے سمارٹ فون کے چکروں میں ہے اور چاہتے ہیں کہ خود بھی سمارٹ نظر آئیں۔ کالج یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے کئی طلبا کا جواب یہ تھا کہ امتحان میں اچھی کارکردگی کے علاوہ ہماری توجہ دوسروں کے لباس پر، تراش خراش پر، چال ڈھال پر ہوتی ہے۔ خود کو فلمی دنیا کا ہیرو سمجھتے ہوئے خیالی دنیا میں جیتے ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کا آزادانہ میل جول، دوستیاں، ناجائز تعلقات معمول کی بات ہوتی ہے۔ فلمی دنیا کی چمک دمک، گلیمر، رنگینیاں تو حقیقت میں ہوتی نہیں، لہذا نوجوانوں کا یہ ٹولہ نفسیاتی بیمار ہو جاتا ہے۔ تمباکو نوشی، منشیات کا استعمال یہاں سے شروع ہو جاتا ہے۔۔

۳) والدین کی خدمت کے شعور کا فقدان

سکرین سے انسان کو مقصد زندگی کبھی نہیں ملتا بلکہ یہ صرف نفسانی لذتوں کو بھڑکانے اور وقت گزاری کا آلہ ہے۔ انسانی رشتوں کی اہمیت کا ادراک کم ہو جاتا ہے۔ مادیت اور مصروفیت کے خود ساختہ جال میں پھنس کر والدین کی خدمت کا احساس بھی کم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بھی باقاعدہ مادر ڈے، فادر ڈے، ٹیچر ڈے منانا شروع ہو گئے ہیں۔ بڑے شہروں میں علاج معالجے اور خدمت کے نام پر باقاعدہ 'اولڈ ہومز' بن گئے ہیں اور کامیاب جا رہے ہیں۔

۴)زیادہ سرمایہ کے چکر میں کئی کئی ملازمتیں یا وسیع کاروبار

وسائل کے حصول کیلئے ہر طرف ایک دوڑ لگی ہوئی ہے، جس میں سب سرگرداں ہیں۔ جسکی وجہ سے خود غرضی پر مبنی کلچر وجود میں آیا ہوا ہے۔ ذاتی کامیابی کو سب چیزوں پر فوقیت حاصل ہے۔ جن اوقات کو رشتہ داروں و متعلقین کیلئے صرف کرنا تھا وہ کاروبار اور ملازمتوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ حقیقی خوشی اگر آپ حاصل کرنا چاہیں تو چند کام کریں:

۱)اپنی ذات سے ماوراء ہو کر سوچ لیا کریں۔

۲)دوسروں کے ساتھ اپنا موازنہ مت کریں۔

۳)زیادہ دولت کے حصول کی تمنا چھوڑ دیں۔

۵)آسائش پسندی کے لیے بیرون ممالک منتقلی:

بے روزگاری اور بے کار رہنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ چنانچہ کئی نوجوان جب گریجوشن کے دو تین سال بعد بے روزگاری کی شکایت کرنے آجاتے ہیں تو میں پوچھتا ہوں ان دو تین سالوں میں آپ کیا کرتے آرہے ہیں۔ کہتے ہیں بس جی چھوٹا موٹا جاب تو کرتے ہیں لیکن پاکستان میں ۳۰ سال بھی کام کریں تو کچھ نہیں ہو گا۔ گویا سارے مزے تو ملک سے باہر ہیں۔

ذاتی تجربے و مشاہدے میں یہ بات آگئی کہ جدید تعلیم یافتہ نوجوان یورپ و دیگر ممالک منتقل ہونے کیلئے مستعد ہیں۔ جو لوگ پہلے سے منتقل ہو گئے ہیں، ان کے والدین تنہائی میں اولاد کی راہ تکتے تکتے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ بیرون ممالک جانے والے افراد اگر بیوی بچے چھوڑ کر جاتے ہیں تو نفسیاتی بیماریاں متعدد اور اگر سارے ساتھ لے جائیں تو دیگر مسائل بے شمار۔

۶)مغربی اور جدید ذہن کی حامل خواتین سے نکاح:

جب بات آگے بڑھتی ہے تو ایسے لوگ مستقل شہریت کے لئے یا اپنی دانشوری کو بروئے کار لاتے ہوئے مغربی عورتوں یا جدید سوچ سے ہم آہنگ خواتین سے شادیاں کرتے ہیں اور پھر انہی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یا ایک شادی یہاں دیس میں اور دوسری شادی پردیس میں کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی باقاعدہ نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا حالات کے سماجی وروحانی اثرات

ا۔ خاندانی نظام کا خاتمہ:

مادی ترقی اور مغربی طرز فکر سے بنیادی دھچکا خاندانی نظام کو لگا ہے۔ باہمی روابط اور میل جول میں انحطاط

پایا جاتا ہے۔ مغرب کی چکا چوند سے متاثر ہونے والے شائد اس بات سے بے خبر ہیں کہ وہاں پر بوڑھے بوڑھیاں قید تنہائی میں پڑے پڑے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں معمر افراد جب بیمار پڑ جائیں تو وہ ہر آن ہر گھڑی بیٹے بیٹیوں حتی کہ پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے درمیان رہتے ہیں۔

۲۔ بڑوں سے ملنے والے تجربہ اور روایت کی پامالی:

بڑوں کے پاس سب سے قیمتی زخیرہ تجربات و مشاہدات کا ہوتا ہے۔ ان سے استفادہ تب ممکن ہے جب تک رابطہ بر قرار رہے اور اسی سے روایات، ثقافت، تہذیب و تمدن میں ترقی ہوتی ہے۔

۳۔ بڑوں کی آخری زندگی کے دکھ اور آزمائشیں:

اولاد کی دوری کے باعث بڑوں کے لیے آخری دور میں کوئی سہارا نہیں رہتا، جس سے ان کی زندگی کے آخری لمحات دکھ اور آزمائشوں سے بھر پور ہوتے ہیں۔

۴۔ حکومتوں اور سوسائٹی پر اضافی بوجھ وغیرہ:

اولاد اور خاندان انسان کا فطری سہارا ہے، جدید ڈیجیٹل زندگی نے انسان سے جب یہ سہارا چھین لیا ہے تو ظاہر ہے حکومت اور سوسائٹی کو سہارا بننے کے لیے کچھ کرنا ہو گا جس سے اس پر اضافی بوجھ پڑتا ہے، نیز سکرین کے نشے نے جس مریضوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے یہ بھی حکومت و سوسائٹی پر مستقل بوجھ ہے۔

۵۔ عقائد میں بگاڑ اور فکری ارتداد:

اکثر نوجوان مذہب کو بھی انٹرنیٹ سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جبکہ انٹرنیٹ پر ہر باطل فرقے اور مسلک نے اپنی دکان کھولی ہے لہذا جب ایک نوجوان دین کے معاملے میں مختلف باتیں سنتا ہے اور قسم قسم تبصرے دیکھتا ہے، تو شکوک و شبہات میں مبتلا ہو کر دین سے متنفر ہو جاتا ہے۔ اس کا گمان ہوتا ہے کہ دین صرف اختلاف کا نام ہے، اس لئے مولویوں سے دور بھاگتا ہے اور گمراہی و ضلالت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

۶۔ بد نظری اور بے راہ روی

دور جدید کا نوجوان شائد بد نظری کی حقیقت سے بلکل واقف نہیں، فحش تصاویر، ویڈیوز نے تو وبائی شکل اختیار کی ہے اور اس سے بچنا محال ہوتا ہے۔ اسی وبا کے نتیجے میں اخلاقی و جنسی جرائم میں جو بے پناہ اضافہ ہوا ہے، اخبارات اس کے شاہد ہیں۔ نفسیاتی بیماریوں کی بنیاد بھی اسی پر ہے۔

سکرین کے نشہ سے نجات کی ایک مثال

یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ بل گیٹس کے بچوں کے حالات بالکل مختلف ہیں۔ بل گیٹس کے نام سے اکثر

لوگ واقف ہیں جو مائیکرو سوفٹ کارپوریشن ٹیکنالوجی اور سافٹ ویئر فراہم کرنے والی کمپنی کا بانی ہے، لیکن بل گیٹس نے اپنے گھر میں بچوں کے لئے چودہ (۱۴) سال کی عمر تک سمارٹ فونز اور دیگر چیزوں کے استعمال پر پابندی لگادی ہے۔

اس بات کا انکشاف انہوں نے ایک برطانوی اخبار 'دی میرر' کو انٹرویو دیتے ہوئے کیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ چونکہ ان کے بچے کم عمر تھے، اس لئے انہوں نے ڈیجیٹل سکرین اڈیکشن (موبائل اور انٹرنیٹ کے استعمال نے آجکل جیسے ایک نشے کی شکل اختیار کی ہے) سے بچانے کے لئے یہ اقدام کیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ رات کے کھانے ڈنر کے دوران بھی کسی کو موبائل فون کے استعمال کی اجازت نہیں ہوتی اور پھر رات کو سونے سے پہلے سے بھی استعمال کو محدود کیا جاتا ہے۔ باقاعدہ اوقات مقرر کردیئے گئے ہیں لہٰذا اسکرین دیکھنے کا وقت مقرر کردہ ختم ہوتے ہی بچے بڑے بروقت سوجاتے ہیں، جس سے مکمل آرام مل جاتا ہے۔

" آپ کو اس بات کا بے حد خیال رکھنا چاہیئے کہ کہاں کہاں موبائل کا استعمال ضروری ہے جیسے دوست احباب سے رابطہ یا ہوم ورک مکمل کرنے میں مدد حاصل کرنا۔۔۔ اور کہاں کہاں اس کا استعمال غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ کھانے کی میز پر ہمارے پاس موبائل نہیں ہوتے، چودہ سال کی عمر تک کسی بچے کو موبائل نہیں دیا جاتا، حالانکہ یہی بچے دوسرے بچوں کی شکایت کرتے ہیں کہ اُن کو تو ملا ہوا ہے ہمیں کیوں نہیں۔۔۔"

یہ بل گیٹس کے انٹرویو کے چیدہ چیدہ اقتباسات تھے، اس میں سارے والدین کے لئے ایک زبردست پیغام ہے کہ کم عمر بچوں کو موبائل سے بچایا جائے اور زیادہ عمر والے بچوں کی ایسی تربیت کی جائے کہ اول تو وہ اس کے مضر اثرات سے محفوظ ہوں اور ثانیاً یہ کہ استعمال کے اوقات مقرر کئے جائیں۔

بچوں کی نفسیات سمجھنا ضروری: والدین کیلئے

سوال یہ ہے کہ ہر جگہ نوعمروں کی بغاوت صدائیں کیوں اٹھتی ہیں؟

تو قصور صرف نوجوانوں کا نہیں بلکہ چند اہم ذمہ داریاں والدین پر بھی عائد ہوتی ہیں۔ مشہور مقولہ ہے کہ ماں کی گود بچے کی ابتدائی درسگاہ ہے۔ یہ بات بجا ہے لیکن اس سے پہلے بھی ایک مرحلہ ہے وہ یہ رحمِ مادر میں بچے کو جیسی غذا مل رہی ہے اور والدین کی سوچ و فکر، دونوں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ نشونمائی محققین و ماہرین نفسیات نے ثابت کیا ہے کہ اگر ماں باپ تمباکو نوشی کرتے ہیں یا منشیات، دوائیوں، کیفین، الکحل (شراب)، نیکوٹین، کوکین، ہیروئن وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں تو انکے نوزائیدہ بچے جسمانی وذہنی عوارض میں مبتلا ہوں گے۔ اسی طرح اگر حاملہ ماں شدید ذہنی دباؤ، غم و صدمے کا شکار ہو تو بچے کی نشونما شدید متاثر ہو گی اور اسی بچے پر دوررس منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ بحیثیت مسلمان ماں باپ کیلئے حلال و حرام کا خیال رکھنا ضروری ہے کیونکہ

اس میں بے احتیاطی سے روحانی واخلاقی اثرات مرتب ہوں گے۔ لہذا اسی مرحلے میں ماں کو صرف طبی معالج کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ذہنی، نفسیاتی وروحانی سہارے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

پیدائش کے بعد دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے بچے اور والدین کے مابین ایک مضبوط جسمانی و جذباتی تعلق۔ یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ یہ بانڈ توسب والدین اور بچوں کا آپس میں ہوتا ہے۔۔ تو بات اتنی آسان نہیں۔ اس لئے کہ ماں باپ بچے صرف خوراک، کھانے پینے اور لباس کی ضروریات کی تکمیل کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور اکثر اسکو بچے پر احسان مانتے ہیں جبکہ بچوں کی نفسیاتی و ذہنی ضروریات کو کوئی جانتا تک بھی نہیں، عمل کیا کرلے گا۔ بچوں کا چیخنا چلانا، ہنسنا مسکرانا، چمٹنا سب کچھ بڑوں کی توجہ حاصل کرنے کیلئے ہوتا ہے۔

ماں کی ذمہ داری صرف دودھ پلانا نہیں اور باپ کا کام صرف بچوں کیلئے کمانا نہیں، بلکہ بچوں کی تعمیر شخصیت بنیادی فریضہ ہے۔ بہر حال بانڈنگ / تعلق کیوجہ سے بچہ لاشعوری طور پر سمجھ لیتا ہے کہ دنیا رہنے کیلئے بہترین جگہ ہے، اسے تحفظ کا احساس ہو جاتا ہے، یہ اعتماد و یقین اسے صرف خوراک کی فراہمی کیوجہ سے نہیں بلکہ اپنے والدین اور بڑوں کے رویوں سے حاصل ہوتا ہے۔

یہی انسانی فطرت کا تقاضا ہے بلکہ اکثر حیوان بھی نوزائیدہ بچوں کو قریب رکھتے ہیں، اس پر کئی سائنسی تجربات ہو چکے ہیں۔ لہذا بچوں کو اپنے آپ سے قریب رکھنا چاہیے۔ جو بچہ والدین کے پیار و محبت سے محروم ہو اس کی شخصیت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

تیسرے مرحلے میں بچوں میں آزادی و خود مختاری کا احساس پیدا ہوتا ہے، ماحول سے بہت کچھ سیکھنے لگ جاتے ہیں، اپنا خیال خود رکھنا، کھانا کھالینا، باتیں سیکھ لینا، ہر کام خود کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ اپنی مرضی چلاتے ہیں۔

اس احساس کے پیدا ہونے کی وجہ ذہنی و جسمانی صلاحیتوں میں ترقی کا ہونا ہے۔ اس دوران بچے چلنے پھرنے، بھاگنے دوڑنے، اچھلنے کودنے کے قابل ہو کر ہر کام خود سرانجام دینا چاہتے ہیں اور اسی میں خوشی و فخر محسوس کرتے ہیں۔ لہذا والدین کو اسی جذبہ کو سمجھ کر بچوں کو ان کاموں کی اجازت دینی چاہیئے جو بچے کرنے کے قابل ہیں۔ اسی سے ان کو اپنے اعصاب پر قابو حاصل ہوگا۔ لیکن اگر والدین صبر وبرداشت کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ کام خود کرنے لگیں جو انکے بچے کرسکتے ہیں تو اس عمل سے بچوں میں احساس شرم و ندامت اور شکوک و شبہات جنم لیتے ہیں۔ یہ تب بھی ہوتا ہے جب والدین بچوں کی حفاظت میں حد سے تجاوز کرتے ہیں۔ بچوں پر والدین کی بے جا روک ٹوک اور بے جا غصے کی بنا پر یا بچوں کے ہاتھ سے ہونے والے حادثات کو سخت تنقید کا نشانہ بنانا مثلاً کوئی گھریلو چیز کیوں توڑ دی۔ پانی یا مٹی سے کمرہ کیوں خراب کیا وغیرہ۔ اس قسم شدید رد عمل سے بچے کی ذہنی نشو نما متاثر ہو جاتی ہے اور اپنی صلاحیتوں پر اسے شدید ندامت اور شک کا احساس ہونے

لگ جاتا ہے۔

والدین، خاندان، معاشرہ، تہذیب و ثقافت بچوں کی تعلیم و تربیت میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ خاندان ایک ادارہ ہے اور تربیتِ اولاد ایک مستقل شعبہ ہے، لہٰذا والدین کا طرز عمل ایسا ہو کہ بچوں کی علم و عمل سہارا بنے اور اس میں نکھار پیدا ہو۔ تین (۳) سال کی عمر میں بچوں کی دلچسپی کھیل کھود اور سماجی تعلقات میں مزید بڑھتی ہے۔ بچے اپنے جذبات و احساسات کو قابو کرنا سیکھتے ہیں تاکہ والدین کے متعین کردہ حدود سے تجاوز نہ کرلیں۔ لہٰذا یہ مرحلہ اچھے برے کی تمیز کے ساتھ متعلق ہے گویا اخلاقیات کی بنیاد یہاں پر قائم ہوتی ہے سو والدین کی ذمہ داری مزید بڑھتی ہے۔

جیسے جیسے بچوں کو اپنی ذات کا احساس، ادراک اور عرفان حاصل ہوتا ہے، زندگی میں انکی دلچسپی بڑھتی ہے۔ ہر کام میں پہل کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں بے پناہ توانائی ہوتی ہے، ناکامیوں کو جلد بھول جاتے ہیں۔ اور تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔

بچوں کی حوصلہ افزائی اور عزت افزائی سے وہ پڑھائی لکھائی میں اور سماجی معاملات میں بہتر محسوس کرتے ہیں، وہ دوسروں کی نسبت زیادہ خوش و خرم رہتے ہیں، زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں، تاہم جو بچے احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں، وہ پڑھائی میں دلچسپی کھو بیٹھتے ہیں، لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرلیتے ہیں، میل جول سے کتراتے ہیں، اور کھیل کھود میں بھی دلچسپی نہیں لیتے۔

بعض جدید والدین اپنے کاروبار و روزگار میں اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو "چائلڈ کیئر" اداروں میں داخل کر کے تربیت کیلئے انکے حوالہ کر دیتے ہیں۔۔ اب اس کے اثرات بچوں اور والدین کے تعلق / بانڈنگ پر کیا پڑیں گے؟ اس کا جواب تو وہی والدین ہی بہتر دے سکتے ہیں۔ تاہم امریکہ میں ہونے والی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے بچوں میں جذباتی و نفسیاتی مسائل پائے گئے۔ والدین کو تلقین کی جاتی ہے کہ اپنے 'پیرنٹنگ' کے معیار کو اونچا رکھیں اور اس بچوں کی نگہداشت میں کوئی کمی نہ آنے دیں۔

چند باتوں پر عمل مفید ثابت ہو سکتا ہے:

ا(کھانے کے اوقات مقرر کئے جائیں اور سب مل کر ایک میز یا دستر خوان پر کھائیں۔

۲ (صحتمند اور متوازن غذا کا استعمال کیا جائے

۳ (کھانے کے اوقات کو خوشگوار اور پر لطف بنایا جائے تاکہ دلچسپی کا سبب بنے

۴ (کھانے کے آداب مقرر ہو

۵ (کوئی توجہ خراب کرنے والی چیز نہ ہو مثلاً ٹی وی یا موبائل وغیرہ

۶ (بحث مباحثہ، مقابلہ آرائی سے مکمل احتراز کیا جائے .

۷ (روزانہ ورزش کے اوقات لازمی مقرر کئے جائیں ایک گھنٹے سے دو گھنٹے تک

۸ (بعض بچے کھیل کے میدان میں جا کر تماشہ بین ہو کر بیٹھ جاتے ہیں لہٰذا ایسے بچوں کی حوصلہ افزائی کر کے انکو کھیل کود میں شامل کرنا چاہیئے۔

۹ (والدین کو خود بھی بچوں کے ساتھ میدان میں اترنا چاہئیے، اس سے بچوں میں توانائی آجاتی ہے۔۔

بچوں کو تعلیم کیلئے کونسے سکول بھیج دیا جائے؟ ایک اہم سوال ہے۔ بچوں کی جسمانی، ذہنی ونفسیاتی بالیدگی اور شخصیت سازی میں سکول کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

Kindergarten : اور Montessori

یورپ کے دو سکولنگ سسٹم بہت مشہور ہیں جہاں بچوں کی روک ٹوک نہیں ہوتی اور ایسا ماحول مہیا کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں خود فیصلے کرنے کے قابل ہوں۔ گوگل سرچ انجن کے بانی شخصیات نے اپنی کامیابی میں اس تعلیمی نظام کی تعریف کی ہے۔ تاہم دوسرے ماہرین دیگر عوامل کی بنیاد پر اس تعلیمی نظام کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ بعض ماہرین کہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہو۔۔ (homeschooling) والدین خود پڑھائیں نہ کہ سکول۔

Parenting Styles

بہترین ' پیرنٹنگ ' کوئی آسان کام نہیں بلکہ ایک وقت طلب اور مشقت طلب عمل ہے۔ اور یہ کوئی مشینی یا کمپوٹرائز کام بھی نہیں اور نہ ہی اسے کسی سی ڈی یا سافٹ وئیر سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ چند منٹوں یا گھنٹوں کا کام نہیں، اس میں وقت کی مقدار سے زیادہ وقت کی کوالٹی درکار ہوتی ہے۔

عمومی طور پر بچے عادات واطوار کو مشاہدات کے ذریعے سیکھتے ہیں۔ بڑے ان کے لئے رول ماڈل ہوتے ہیں۔ جیسا بڑے کرتے ہیں ویسا چھوٹے کرتے ہیں۔ زبانی جمع خرچ اور گفتار سے کام نہیں چلتا، یہاں بات کردار کی ہوتی ہے۔ جس فعل پر بچے کو بدلہ یا انعام ملتا ہے، وہ پختہ ہو جاتا ہے اور جس عمل پر اسے سزا ملتی ہے وہ عمل کمزور ہو جاتا ہے۔

بچوں کی تربیت کے حوالے سے والدین کی تین قسمیں ہیں:

۱) آزاد خیال والدین(Permissive Parents) ۔

یہ والدین تھوڑے ہی ہوتے ہیں اور بچوں کے معاملے میں لاپرواہ ہوتے ہیں۔ ایسے والدین جن کے قواعد وضوابط ناجائز و نامناسب حرکات پر بچوں کی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے۔ ان کے بچوں کو آزادی ہوتی ہے چاہے وہ

شرارتیں کریں، بری عادتیں سیکھیں یا ٹی وی دیکھتے رہیں۔ حتی کے فلموں، ڈراموں اور کارٹون دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ گویاتربیت اولاد کی بجائے دیگر کام کاج والدین کے لئے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی لئے بچے اچھے اخلاق، عادات واطوار انہیں اپناتے بلکہ خودسر بن جاتے ہیں۔ اپنے قابو سے باہر ہوتے ہیں، معاشرے میں منفی کردار ادا کرتے ہیں۔

۲)دوسرے انتہاپر آمرانہ والدین(Authoritarian Parents)۔

یہ وہ والدین ہوتے ہیں جن کے قواعد وضوابط بہت سخت ہوتے ہیں اور خلاف ورزی کی صورت میں مار پیٹ اور سزا دیتے رہتے ہیں۔ ان کے قواعد وضوابط کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کا خیال ہوتا ہے کہ "جیسا میں کہوں ویسا کرنا پڑے گا" ایسے والدین کے بچوں کے جذبات مجروح ہو جاتے ہیں، ان کی عزت نفس گر جاتی ہے۔ ایسے والدین فیصلے جاری کرتے ہیں لیکن وجوہات کی وضاحت نہیں کرتے۔ یہ بچے عموماً خوفزدہ، اداس و پریشان رہتے ہیں۔ زندگی میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھاسکتے، ان کی ''کمونیکیشن سکلز'' کمزور ہوتی ہے، لوگوں سے کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔ اسی طرح ان کی شخصیت پر کئی ایک منفی اثرات آتے ہیں۔ اور اکثر یہی بچے بڑے ہو کر باغی ہو کر جرائم پیشہ بن جاتے ہیں۔

۳)Authoritative Parenting(The Best Approach)۔

بچوں کی پرورش اور تربیت میں یہ والدین مہربان، شفیق اور نرم دل ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود مناسب رویئے پر بہت توجہ دیتے ہیں۔ وہ متعین کردہ حدود کے اندر بچوں کے آزادی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ وہ آزادی اور سختی کے مابین توازن برقرار رکھتے ہیں۔ مثلاً غلطی کی صورت میں بچے کو پیار سے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہتے ہیں: جانتے ہو تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔۔ آؤبات کرتے ہیں کہ آپ آئندہ ایسی صورتحال کا کیسے سامنا کریں گے۔ لہذا بچے اچھی عادات اپناتے ہیں، خوش رہتے ہیں، نفس پر قابو رکھنے والے، خوداعتماد، زندگی اہداف کے تحت گزارنے والے ہوتے ہیں، پڑھائی میں کارکردگی بہتر ہوتی ہے اور معاشرے میں ذمہ دارانہ کردار ادا کرتے ہیں۔ سماجی تعلقات نبھاتے ہیں اور دباؤ کا مقابلہ باآسانی کرسکتے ہیں۔

سندھ کے کچھ نامور علماء

محمد فہیم سکھروی

مولانا فخر الدین شاہؒ (۱۸۸۰ء۔۱۹۶۳ء):

فخر الدین شاہ بن محمد عارف شاہؒ بن سیّد فخر الدین بن سیّد علی محمد کلاں گھوٹکی کے مبارک شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی پیدائش گھوٹکی کے محلے فخر الدین شاہ میں اندازاً ۱۲۹۸ھ بمطابق ۱۸۸۰ء میں ہوئی[۱]۔ حتمی تاریخ پیدائش تلاش وبسیار کے باوجود معلوم نہ ہو سکی۔ البتہ کہا جاتا ہے کہ آپ اپنے چھوٹے بھائی سے ۸ مہینے بڑے تھے۔[۲]

جوانی میں زیادہ علم حاصل نہ کیا لیکن مولانا محمد اسماعیل بھٹوؒ کے مشورے سے حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کے ساتھ تعلق ہوا تو آپ پر علمی و روحانی رنگ چڑھ گیا۔ فقہ کی خاص کتابوں کے اردو اور فارسی تراجم منگوا کر ان کا گہرا مطالعہ کیا۔ عالمگیری، ہدایہ، شرح وقایہ، کنزالدقائق اور دوسری کتابوں کے تراجم پورے عبور اور مہارت کے ساتھ پڑھے۔ علامہ غلام مصطفٰی قاسمیؒ نے آپ کو عالم کہا ہے۔[۳]

آپ کی دینی خدمات میں مدرسہ عربیہ قاسم العلوم گھوٹکی کا اہتمام اور عوام کے شرعی فیصلے ہیں۔[۴] آپ کی کوئی تصنیف نہیں۔ البتہ حضرت تھانویؒ کے ساتھ خط و کتابت کے سلسلے میں چند خطوط تحریری صورت میں موجود ہیں[۵] آپ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ تھے[۶]۔ آپ کے دو بیٹے تھے۔ ۱۔ مولانا حبیب اللہ شاہ ۲۔ سیّد محمد عارف شاہ[۷]۔ آپ کی وفات ۱۹۶۳ء میں گھوٹکی شہر میں ہوئی۔[۸]

مولانا حبیب اللہ شاہؒ (۱۹۰۲ء۔۱۹۷۹ء):

حبیب اللہ بن فخر الدین شاہؒ بن محمد عارف بن سیّد فخر الدین بن سیّد علی محمد کلاں غوث پور (کندھ کوٹ)[۹] میں ۱۳۲۳ھ بمطابق ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ اپنے والد کے بڑے بیٹے تھے۔

آپ نے اپنے دور کے مایہ ناز علماء سے علم حاصل کیا۔ ان میں مولانا امید علیؒ، مولانا نور محمد انڈہرؒ اور دیگر بڑے علماء بھی شامل ہیں۔ آپ خود فرماتے تھے کہ کافیہ مولانا نور محمد چاچڑ کے پاس پڑھی اور مولانا نور محمد چاچڑ

معقول اور نحو کے باپ تھے۔ آپ نے علم حاصل کرنے میں بھرپور توجہ دی۔ اپنے والدِ فخر الدین شاہؒ کی وفات کے بعد مدرسہ عربیہ قاسم العلوم گھوٹکی کے اہتمام کی ذمّہ داری سنبھالی اور تقریباً ۱۶ سال یہ ذمّہ داری سر انجام دیتے رہے۔

تعلیم حاصل کرنے کے دوران آپ کی نظر (بینائی) کمزور ہو چکی تھی اس لیے فراغت کے بعد درس و تدریس و تصنیف کا کام نہ کر سکے۔ (۱۰) علامہ قاسمیؒ فرماتے تھے مولانا الحاج سیّد فخر الدین شاہ کا بڑا بیٹا مولانا سیّد حبیب اللہ ایک ذہین اور صوفی عالم ہے مدرسے کا روح رواں ہے (۱۱)۔ مولانا حبیب اللہ شاہؒ کو پہلی بیوی سے صرف ایک بیٹی تھی۔ جبکہ دوسری بیوی سے ۳ بیٹے عبید اللہ شاہ، خلیل احمد شاہ اور عنایت اللہ شاہ تھے (۱۲)۔ آپ نے طویل بیماری کے بعد ۲۳ محرم الحرام ۱۹۷۹ء پیر کے دن وفات پائی۔ (۱۳)

مولانا خلیل احمد شاہ (پیدائش ۱۹۴۹ء):

خلیل احمد بن سیّد حبیب اللہ بن سیّد فخر الدین شاہؒ بن سیّد محمد عارف شاہؒ بن سیّد فخر الدین بن سیّد علی محمد کلاں ۱۷ دسمبر ۱۹۴۹ء بمطابق ۱۳۷۱ھ گھوٹکی شہر کے محلے فخر الدین شاہ میں پیدا ہوئے۔

آپ نے پہلے پانچ درجے پرائمری تعلیم اسکول سے حاصل کی۔ اس کے بعد مفتی عبد الحق چنہؒ (صدر مفتی مدرسہ عربیہ قاسم العلوم گھوٹکی) کے پاس فارسی کی کتابیں گلستان، بوستان پڑھیں، مولانا ثناء اللہ سنگھڑؒ کے پاس دوسرے سال میں سکندر نامہ، زلیخا کتابیں پڑھیں۔ مولانا عبد الهادیؒ کے پاس ہدایۃ النحو پڑھی اس کے بعد ۱۰ سال علامہ غلام مصطفٰی قاسمیؒ کے پاس تعلیم حاصل کی۔ آپ ۱۹۷۴۔۷۵ء میں فارغ التحصیل ہوئے اور اسی مدرسہ عربیہ قاسم العلوم گھوٹکی میں دستار بندی ہوئی۔ آپ نے بہت سی کتب درسیہ پر حواشی لکھے ہیں، منطق کا ایک رسالہ تعریف الاشیاء کی شرح ہے۔ سندھی میں شرح تعریف الاشیاء تین جلدوں میں ہے لیکن وہ مطبوع نہیں۔ مقاماتِ حریری کے ۱۵ مقامات کی شرح لکھی ہے سندھی میں تین جلدوں میں وہ بھی غیر مطبوعہ ہے۔ اپنے والد محترم سیّد حبیب اللہ شاہؒ کی وفات کے بعد سے لے کر اب تک مدرسہ عربیہ قاسم العلوم گھوٹکی کے اہتمام کی ذمّہ داریاں سر انجام دے رہے ہیں۔ (۱۴) علامہ قاسمیؒ فرماتے تھے مولانا حبیب اللہ کا بڑا بیٹا سیّد خلیل احمد شاہ اسی مدرسے میں اگرچہ ابتدائی درجے میں پڑھ رہا ہے لیکن اسکا ذہن و ذکاء کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بچے کی تعلیم و تربیت اچھی رہی تو آگے چل کر اس خاندان کا ایک بڑا علمی روشن ستارہ ہو گا۔ (۱۵)

حوالہ جات

۱۔ زبانی احوال سیّد نور محمد شاہ پڑپوتے مولانا فخر الدین شاہؒ ۱۹۔۰۵۔۲۰۱۶ء گھوٹکی

۲۔ لغاری، مولانا کلیم اللہ، سات ستارے، مکتبہ ہاشمیہ صدر کراچی طبع اول ۱۴۳۰ھ / ۲۰۰۹ء، ص/۱۱

۳۔ قاسمی، علامہ غلام مصطفی، مقالات قاسمی، نفیس پرنٹنگ پریس، لجپت حیدرآباد ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص/ ۱۸۲
۴۔ زبانی احوال مفتی عبدالحق چنہ ۰۳-۰۳-۲۰۱۶ء: گھوٹکی
۵۔ زبانی احوال مولانا خلیل احمد شاہ (پوتے مولانا فخر الدین شاہؒ) ۰۳-۰۳-۲۰۱۶ء گھوٹکی
۶۔ مجذوبؒ خواجہ عزیز الحسن، مولانا عبدالحقؒ، اشراف السوانح، باہتمام محمد اسحاق ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان ۱۴۱۴ء، ج/۳، ص/ ۳۴۲
۷۔ زبانی احوال مولانا حبیب اللہ شاہ بن مولانا خلیل احمد شاہ ۱۷-۰۵-۲۰۱۷ء گھوٹکی
۸۔ ماہانہ شریعت سوانح حیات نمبر آکتوبر۔ نومبر ۱۹۸۱ء، ایضاً، ص/ ۴۶۸
۹۔ زبانی احوال مولانا حبیب اللہ شاہ بن مولانا خلیل احمد شاہ ۱۷-۰۵-۲۰۱۷ء گھوٹکی
۱۰۔ ماہنامہ شریعت سوانح حیات نمبر ایضاً، ص/ ۴۶۹، ۴۶۸
۱۱۔ مقالات قاسمی ایضاً، ص/ ۱۸۳
۱۲۔ زبانی احوال سیّد نور محمد شاہ بن عبید اللہ شاہ بن مولانا سیّد حبیب اللہ شاہ ۲۰-۱۱-۲۰۱۶ء گھوٹکی
۱۳۔ ماہانہ شریعت سوانح حیات نمبر سکھر ایضاً، ص/ ۴۶۹
۱۴۔ زبانی احوال مولانا خلیل احمد شاہ (مہتمم مدرسہ عربیہ قاسم العلوم گھوٹکی) ۲۰-۱۱-۲۰۱۶ء گھوٹکی
۱۵۔ مقالات قاسمی ایضاً، ص/ ۱۸

عورت کی گواہی نصف کیوں ہے؟

محمد طفیل کوہاٹی

عموماً فیمنسٹ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام میں خواتین کی حقوق تلفی کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اسلام نے خاتون کی گواہی آدھی رکھی ہے۔ بعض خواتین فہم وفراست میں مردوں سے بدرجہا بڑھی ہوتی ہیں تو آخر میں ان میں کیا ایسی کمی ونقص ہے کہ شریعت اسلامی گواہی کے باب میں ایک مرد کو دو عورتوں کے مساوی سمجھتی ہے جب کہ بعض معاملات میں عورت کی گواہی کا سرے سے اعتبار ہی نہیں کرتی۔ ذیل میں ہم اسی اعتراض کا مختلف پہلوؤں سے مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

(۱) قانونی پہلو:

دنیا میں کوئی بھی قانون جس طبقے کے بارے میں بنتا ہے تو اس کے احوال واقعیہ کو مجموعی طور پر ضرور پیش نظر رکھا جاتا ہے، گواہی دینا ایک ذمہ داری ہے، ایک بھاری بوجھ ہے اور بعض اوقات اس کی ادائیگی زندگی کے رسک کی قیمت پر کی جاتی ہے، گواہی کے لیے مجلس قضا یعنی عدالت تک جانا بھی ضروری ہوتا ہے اور بعض اوقات اپنے انتہائی اہم امور کو چھوڑنا بھی پڑتا ہے۔ گواہی کا قانون اللہ تعالی کی ذات علیم وخبیر نے از خود بنایا ہے لہذا اگر اس میں خاتون کا حصہ وکردار محدود ہے تو یہ قطعا خاتون کے مقام کی فروتری نہیں بلکہ مسلمہ اصولوں کے تحت عورت کے احوال واقعیہ کی رعایت اور مصلحت کی وجہ سے ہے۔ اگر اس میں عورت کے احوال وظروف کی رعایت رکھے بغیر اس پر یہ بھاری بوجھ مرد کے برابر لاد دیا جاتا تو یقینا قانونی لحاظ سے یہ منصفانہ بات نہ ہوتی اور قانونی جبر کے مترادف ہوتا۔

(۲) سماجی پہلو:

دنیا کی تمام مہذب اقوام حتی کہ ہمارے مخلوط نظام تعلیم میں بھی یہ قانون موجود ہے کہ خاتون کو اگر کسی مرد سے پرسنل ڈسکشن کی ضرورت ہو یا اسے سماج میں مردوں کے ساتھ تعامل کی ضرورت درپیش ہو تو وہ خلوت میں اکیلی نہیں جائے گی بلکہ دو خواتین جائیں گی۔ دو کے ساتھ جانے میں ان کی حفاظت ہے کہ سماجی برائیوں کا انہیں شکار نہیں بنایا جا سکتا، کوئی انہیں ہریس کرنے کی جرات آسانی سے نہیں کر سکتا، سماجی طور پر کسی معاملے

میں دو خواتین کا یکجا پیش ہونا ہراسمنٹ سے بچاؤ ہے چونکہ گواہی کی ادائیگی کے لیے خاتون کو بہر حال سماج میں نکلنا پڑتا ہے اس لیے شریعت نے گواہی میں خواتین کی کم از کم مقدار دو رکھی ہے۔

(۳)نفسیاتی پہلو:

نفسیاتی لحاظ سے انسان اپنے ہم جنس کے ہوتے ہوئے اعتماد محسوس کرتا ہے ،دو خواتین ہوں تو کسی معاملے میں ان اعتماد بحال رہنا بنسبت تنہائی کے آسان رہتا ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے مردوں میں اکیلی اور اجنبی خاتون اظہار خیال کے مواقع پر عموماً صنفی اختلاف کی وجہ سے پریشر ائز ہو جاتی ہے۔ چونکہ گواہی عموماًمرد ججوں کے سامنے سوال و جواب اور جرح و قدح کا سامنا کر کے پیش کرنی ہوتی ہے اس میں عورت کے عمومی نفسیات سے یہ بعید نہیں کہ دباؤ میں آجائے اور کچھ کا کچھ کہہ ڈالے ،اس کا اعتماد بر قرار رکھنے کی یہی صورت معقول ہے کہ اس کے ساتھ اظہار خیال کرنے والی ایک دوسری ہم صنف موجود ہو اور دونوں کا ذہنی رخ ایک طرف ہو اور دونوں ایک ہی بات پیش کر رہی ہوں تاکہ ایک دوسرے سے نفسیاتی طور پر اعتماد ملتا رہے۔

(۴) طبی یعنی میڈیکل سائنس کا پہلو:

گواہی میں دو خواتین کی ضرورت کی ایک کامن وجہ قرآن مجید نے خود بیان کی ہے کہ اگر ایک خاتون بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے، میڈیکل سائنس اس بات پر متفق ہے کہ خاتون اور مرد کی دماغی کمیسٹری میں زمین آسمان کا فرق ہے۔اب دلیل سمجھنے کے لیے کچھ مقدمات سمجھیں۔

۱۔ پہلا مقدمہ کہ خاتون اور مرد کے باہمی دلچسپی کے امور میں اکثر تضاد یا بڑا فرق رہتا ہے، مرد کے دلچسپی کے عمومی امور گھر سے باہر کے معاملات ہیں جبکہ خاتون کے دلچسپی کے زیادہ تر امور گھریلو چیزیں ہوتی ہیں، کند ذہن خاتون کو بھی سال پہلے دیکھے ہوئے لباس اور زیور کی ساخت یاد رہتی ہے، گھر کے برتن نہیں بھولتے جبکہ مرد کے لیے ان چیزوں کو یاد رکھنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے، وجہ دلچسپی کے امور کا فرق ہے۔

۲۔ دوسرا مقدمہ کہ گواہی میں منظر کو محفوظ کرنا ضروری ہوتا ہے اور معاملہ کو یاد رکھنا لازمی ہوتا ہے۔

۳۔ تیسرا مقدمہ انسان اسی چیز کو با آسانی یاد اور گرفت میں رکھ سکتا ہے جو فطری طور پر اس کی دلچسپی کی چیز ہو، یعنی اس کی دماغی کمیسٹری اس کی طرف میلان رکھے۔ اب آئیں گواہی کی طرف۔ گواہی کی کئی اقسام ہیں اور ہر ایک میں عورت کی گواہی کا مستقل حکم ہے۔

مختلف معاملات میں خواتین کے شہادتی کردار کے مصالح و حکم

۱۔ حدود اور قصاص میں خاتون کی گواہی معتبر ہی نہیں۔ کیونکہ قتل، ایکسڈنٹ، حوادث وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ عورت کی دماغی کمیسٹری طبعی طور پر خوف کے شدید تاثر سے انہیں پوری طرح محفوظ نہیں کرپاتی، گولی

کیسے چلی؟ کتنے فاصلے سے چلی؟ کس بندوق سے چلی؟ قاتل کس طرف سے آیا؟ ایسے کئی امور اس وقت کی ہولناکی کے باعث عورت محفوظ ہی نہیں رکھ پاتی بلکہ حوادث میں مرد و عورت کی کیفیات پر جو سروے ہوا ہے اس رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ مردوں کے نسبت ۹۹ فیصد خواتین اس وقت بے ہوش ہو جاتی ہیں یا ان کا پیشاب خطا ہو جاتا ہے، اسی طرح عورت کی فطری حیا کے پیش نظر شریعت کو زنا میں جس کیفیت سے گواہی مطلوب ہے، عورت اس کیفیت سے دیکھ اور محفوظ ہی نہیں کر سکتی اگر محفوظ کر لے تو عموماً ایک باحیا اور نارمل عورت کے لیے اسے مردوں کی مجلس میں بیان کرنا ممکن نہیں ہوتا کیونکہ اس کی دماغی کمیسٹری اس چیز کے منافی ہے۔

حدود و قصاص میں خاتون کو گواہی کا کردار نہ دینے کی پشت پر ایک تہذیبی محرک بھی موجود ہے کہ جرائم جس سطح کے ماحول و معاشرے میں وقوع پذیر ہوتے ایسے ماحول و مواقع میں اسلامی معاشرہ خاتون کے بالقصد اختلاط یا موجودگی کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔

۲۔ گواہی کی دوسری قسم ان معاملات میں گواہی دینا ہے جو صرف خواتین کا موضوع ہیں، ان میں صرف خاتون بلکہ ایک خاتون کی گواہی بھی معتبر ہے، وہ ولادت و نسب کے بعض امور ہیں۔ چونکہ مردوں کو ان معاملات سے کوئی زیادہ سروکار نہیں ہوتا اور عموماً اسلامی معاشرت میں خاتون ہی ان معاملات کو دیکھتی ہے، لہذا اگر ان میں شہادت و گواہی کی ضرورت پیش آئے تو اس کی ذمہ داری خاتون ہی کو نبھانی پڑتی ہے۔

۳۔ تیسرے قسم کے سوشل معاملات اور تنازعات ہیں چونکہ اسلامی معاشرہ میں سوشل امور بنیادی طور پر مرد کی ذمہ داری ہے لیکن ایک درجہ میں عورت کا بھی ان میں شریک ہونا جائز ہے لہذا مرد کی بنیادی ذمہ داری ہونے کے باعث تو وہ مرد ہی کے دلچسپی کا موضوع ہیں جیسے خرید و فروخت، اجارہ وغیرہ۔۔ تاہم خاتون کی ثانوی شرکت کے پیش نظر اسے بھی ان معاملات میں گواہ بننے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے چونکہ یہ خاتون کی بنیادی ذمہ داری نہیں اس لیے اس کی دلچسپی اور دماغی کمیسٹری کا لحاظ رکھ کر شریعت نے دو خواتین پر ایک مرد کی ذمہ داری ڈالی ہے تاکہ انہیں گواہی یاد رکھنے میں آسانی ہو۔

گواہی کے نظام میں خاتون کے کردار کی تعیین و تشکیل حقوق نسواں کے حوالے سے شریعت اسلامیہ کا عجیب شاہکار ہے۔ اس تشریع میں طبی، نفسیاتی، تہذیبی اور سماجی پہلوؤں کی پوری رعایت ہے، دنیا کی کسی تہذیب میں خواتین کے حقوق کا اس باریک بینی سے لحاظ رکھ قانون سازی نہیں کی گئی، اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلام میں قانون کی تشکیل خود خداوند قدوس کی رحمت خاصہ کے صدقے ہے جبکہ دنیا کی دیگر تہذیبوں میں انسان کے عقل پراگندہ نے یہ بوجھ اٹھانے کی کوشش کی ہے، ظاہر ہے انسان کی عقل نارسا اور قادر مطلق و حکیم و خبیر کی قانون سازی میں کوئی جوڑ ہی نہیں ہو سکتا نہ انسانی عقل قانون خداوندی کے مصالح و حکم کا احاطہ

کر سکتی ہے۔

کیا خاتون ناقص العقل ہے؟

فیمنسٹ یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ دین اسلام نے خاتون کو ناقص العقل کہا ہے اور اس عقلی نقصان کے پیش نظر انہیں گواہی میں محدود کردار دیا گیا ہے۔ یاد رکھیں! کہ ناقص عربی میں اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا جو اردو میں استعمال ہوتا ہے، ناقص کا معنی معیوب نہیں بلکہ ادھورا ہے، جس حدیث میں عورت کے نقص عقل کی بات کی گئی ہے، اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ خاتون کے عقلی کمیسٹری ادھوری ہے اور یہ میڈیکل سائنس میں بھی طے ہے کہ وہ سوشل معاملات جن میں مرد بنیادی ذمہ دار ہے ان میں عورت کی معلومات، اس کا تجربہ اور دماغی کاوشیں ادھوری ہوتی ہیں۔ کیونکہ عورت کو ان سے واسطہ کم پڑتا ہے، جن امور سے واسطہ کم ہو ان میں معلومات اور تجربہ کا ادھورارہ جانا مسلم ہے۔ اگر حدیث میں اس واقعی اور نفس الامری بات کو بیان کیا گیا ہے، تو اس سے یہ پہلو کہاں سے نکلا کہ اس میں خاتون کے مقام کو گھٹایا گیا ہے، اگر خاتون کے بارے کوئی امر واقعی بیان کیا جائے مثلاً یہ کہا جائے کہ خاتون کی داڑھی نہیں ہوتی، یا وہ صنف نازک ہے تو آخر اس سے خاتون کا مقام و مرتبہ کیونکر گھٹ گیا۔ باقی حدیث میں عورت کو ناقص العقل ارشاد فرمانا یہ عورت کے آئی کیو کی فوقیت کے منافی نہیں کسی عورت کا آئی کیو مرد سے بہتر ہو سکتا ہے اور ہوتا بھی ہے۔

نیز آئی کیو میں بھی دیہاتی عورت کا دیہاتی مرد اور شہری عورت کا شہری مرد، تعلیم یافتہ عورت کا تعلیم یافتہ مرد سے تقابل کریں تو اس لحاظ سے دنیا میں مردوں کا آئی کیو بھی زیادہ ہے۔ لیکن گواہی کی تشریع کا مدار مذکورہ امور پر ہے جن کی وضاحت کی گئی۔ آئی کیو پر اس کا مدار نہیں۔

هذا ما عندی والعلم عند الله

حضرت حاجی شیر حسن رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال

ادارہ

حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ کے خلیفہ اجل حضرت ڈاکٹر حاجی شیر حسن رحمۃ اللہ علیہ ۲۶ جون ۲۰۲۴ء بروزِ بدھ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آپ شعبہ وائرولوجی میں FullBright ایوارڈ پر امریکہ سے پی ایچ ڈی و پوسٹ ڈاکٹریٹ اور عالمی سطح کے سائنسدان و ریسرچر تھے۔ بطور ڈین زرعی یونیورسٹی سے ۲۰۰۳ء میں ریٹائر ہوئے۔ ریاست پاکستان نے آپ کی تعلیمی و تحقیقی خدمات پر آپ کو تمغہ امتیاز سے نوازا۔

آپ ضلع صوابی کے ایک گاؤں زروبی محلہ ڈھکی خیل میں جناب غلام حسن کے ہاں ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ میں حاصل کی۔ ۱۹۵۹ میں میٹرک کے بعد اسلامیہ کالج پشاور آئے۔ ۱۹۶۴ء میں بی ایس سی آنرز ایگریکلچرل کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد ایم ایس سی میں داخلہ لیا اور فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کرکے گولڈ میڈل لیا۔

ملازمت کا آغاز فارسٹ انسٹی ٹیوٹ پشاور میں ریسرچ افسر کی حیثیت سے کیا۔ تقریباً ایک سال اس پوسٹ پر کام کرنے کے بعد یکم مارچ ۱۹۶۷ء کو پلانٹ بریڈنگ اینڈ جینٹکس ڈیپارٹمنٹ میں بطور لیکچرار تقرری ہوئی۔ بعد ازاں ۱۹۷۰ء میں اسٹنٹ پروفیسر کے درجے پر ترقی ہوئی۔ فروری ۱۹۸۰ء کو گورنمنٹ کے وظیفہ پر مزید تعلیم کے لئے امریکہ تشریف لے گئے۔ ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۴ء واشنگٹن سٹیٹ یونیورسٹی سے امراض نباتات (Plant Pathology) میں ایم ایس اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ امریکہ میں قیام کے دوران ہی ۱۹۸۲ء میں ایسوسی ایٹ پروفیسر بن گئے۔ ۱۹۸۴ء میں جب پاکستان واپسی ہوئی تو زرعی یونیورسٹی پشاور میں شعبہ plant pathology کی بنیاد رکھی۔ یہ شعبہ پہلے اس یونیورسٹی میں نہیں تھا۔ یوں آتے ہی ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین بن گئے اور ۱۹۹۷ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۸۵ء میں پروفیسر کی پوسٹ پر ترقی ہوئی۔ ۱۹۹۱ء میں تین مہینے کے لئے TIPAN پروجیکٹ کے پروگرام میں دوبارہ امریکہ گئے۔ جبکہ ۱۹۹۲ء میں Full Bright ایوارڈ ملا اور دوبارہ ایک سال کے لئے امریکہ Post Doc کے لئے تشریف لے گئے۔ جہاں واشنگٹن سٹیٹ یونیورسٹی سے ملحقہ ایک ریسرچ سٹیشن میں تحقیقی کام کرنے کا موقع ملا۔ ۱۹۹۳ء میں واپس پاکستان آئے۔

۱۹۹۷ء میں تین سال کے لئے فیکلٹی آف Plant Protection کے ڈین مقرر ہوئے۔ ۲۰۰۰ء میں دوسرے ٹرم کے لئے دوبارہ ڈین کی حیثیت سے تقرری ہوئی جو جولائی ۲۰۰۳ ریٹائرمنٹ تک برقرار رہی۔

ہائیر ایجوکیشن کمیشن پاکستان نے سن ۲۰۰۰ء میں آپ رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی بہترین تعلیمی خدمات پر Best teacher ایوارڈ سے نوازا۔ یاد رہے کہ اس یونیورسٹی میں پہلی بار کسی کو یہ اعزاز ملا۔ حکومتِ پاکستان نے سن ۲۰۰۲ء میں آپ رحمۃ اللہ علیہ کو صدارتی ایوارڈ تمغہ حسن کارکردگی دیا۔ ہائیر ایجوکیشن کمیشن نے ۲۰۰۳ء میں پہلی بار ایک نیا پروگرام Reemployment of Distinguished Professors متعارف کیا۔ پورے پاکستان سے کل ۱۲ ممتاز ترین پروفیسر منتخب ہوئے جن میں ایک حضرت ڈاکٹر شیر حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ دسمبر ۲۰۰۵ء میں ملازمت سے سبک دوش ہو گئے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے زمانہ طالبعلمی میں حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے مواعظ وملفوظات کے مطالعہ سے متاثر ہو کر ۱۹۶۴ء میں حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ سے بیعت کی اور طویل عرصہ اپنے شیخ سے باطنی اصلاح لیتے رہے۔ جس کی مکمل تفصیلات آپ کے اصلاحی مکتوبات سے معلوم ہوتی ہیں۔ یہ مکتوبات تین جلدوں میں چھپ چکی ہیں۔ آپ سفر وحضر میں کامل اکتیس سال اپنے شیخ کے پاس رہے، رہائش بھی انہی کے قریب اختیار کی۔ آپ نے حضرت مولانا اشرف صاحب کے کئی قیمتی بیانات قلمبند کیے، مجلسی ارشادات کے کئی رجسٹر لکھے، جو انہوں نے مدیر البیان مولانا محمد طفیل کوہاٹی کے حوالے کیے کہ انہیں مرتب کر کے شائع کریں۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ کے اصلاحی مکاتیب تین جلدوں میں چھاپے، جن میں ۲۰۰ صفحات پر آپ کے ذاتی مکاتیب ہیں۔ اپنے شیخ کی مستند اور مفصل سوانح بھی دو دیگر حضرات کے تعاون سے مرتب کی۔ حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو ۱۹۷۳ء میں خلافت سے نوازا۔

زندگی کے آخری سالوں میں جب آپ حیات آباد میں اپنے برادر نسبتی کے ہاں مقیم تھے۔ اصلاحی مجلس منعقد کرتے رہے، آپ کی مجلس میں کئی کتابوں کی تعلیم مکمل ہوئی، جن میں احیاء العلوم، آپ بیتی شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ، الاعتدل فی مراتب الرجال، اسلامی تصوف اور میڈیکل سائنس وغیرہ کتابیں شامل ہیں، یہ کتابیں عموماً جناب عمر فاروق پڑھتے رہتے تھے، ان کی صوتی ریکارڈنگ آپ کے قیمتی ارشادات سمیت نیٹ پر محفوظ ہے۔ آپ ماہنامہ غزالی پشاور کے سرپرست بھی رہے۔ حضرت ڈاکٹر فدا محمد مدظلہم کی قائم کردہ سیاسی تحریک "تحریک درویشان" سے سرپرستانہ تعلق تھا، اور سیاسی نظام کی اصلاح کے لیے اس سے امیدیں وابستہ تھیں۔

آپ کے ایک ہی خلیفہ ڈاکٹر عالم خان صاحب ہیں۔ نسبی اولاد نہ تھی لیکن روحانی اولاد ہمیشہ آپ کی خدمت کے لیے آپ پر جان چھڑکتی رہی۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: سب خرابیوں اور بداعمالیوں کی جڑ ۲ باتیں ہیں: دنیا کی محبت اور موت کی یاد نہ ہونا۔ اللہ والوں کی صحبت میں آپ کے یہ دونوں مسئلے حل ہو جائیں گے۔ فرماتے: اللہ پاک اور بندہ کے بیچ تین بڑی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں جن کے باعث وہ خسارے میں پڑ جاتا ہے: شرک، گناہ اور غفلت۔ جب انسان ان تینوں رکاوٹوں کو توڑ دیتا ہے تو اللہ پاک اس پر اپنی معرفت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ فرماتے: زندگی میں کبھی شریک کاروبار نہ کرنا، خواہ اپنے باپ کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔ جن گھروں میں کئی کمانے والے افراد یا گھرانے ہوں اور آمدنی وخرچ کا تعین نہ ہوتا ہو تو وہ سب مشتبہ ہے، اس سے لازمی بچیں۔ فرماتے: کبھی بھی کسی کے ظاہری حلیے، پگڑی، ڈاڑھی، ٹوپی، خوابوں، ذکر وغیرہ دیکھ کر اُس کے بارے میں رائے قائم نہ کرنا بلکہ مالی اور معاشرتی معاملات کو دیکھنا۔ فرماتے: کفار کے ممالک میں تعلیم، روزگار، تبلیغ وغیرہ میں جانا پڑے تو یاد رکھنا کہ کبھی بھی وہاں آباد ہونے کی نیت نہ کرنا۔ فرماتے: دعوتِ مہمانی کے تین درجے ہیں: اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ۔ اعلیٰ درجہ یہ کہ نقدی دی جائے تاکہ وہ اپنی سہولت کے تحت اسے استعمال کرے۔ متوسط درجہ یہ کہ کھانا تیار کر کے اُن کے ہاں لے جائے تاکہ وہ جب اور جسے چاہے کھلائے۔ ادنیٰ درجہ یہ کہ اپنے گھر پر اسے کھانے کیلئے بلائے، اب وہ آپ کے وقت اور نظم کا پابند ہو گا۔ فرماتے: میرے جو ساتھی بھی تعلیم وتدریس سے وابستہ ہیں وہ ضرور اپنی کوالیفکیشن بڑھائیں بلکہ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اُن سے زبردستی پی ایچ ڈی کرواؤں۔ فرماتے: ۱۴۰۰ سالہ تاریخ گواہ ہے کہ عالمِ اسلام کو جب بھی نقصان ہُوا یا کوئی سانحہ رُونما تو ہمیشہ اس کے پیچھے دو ہی قوتیں سامنے آتی ہیں: یہود اور شیعہ۔ فرمایا کہ ملازمت کے ابتدائی دنوں میں اسلامیہ کالج میں بطور بیرونی ممتحن ڈیوٹی لگی۔ اس کے بعد معلوم ہُوا کہ ہمارے حضرت مولانا اشرف رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سفارشیوں کا تانتا بند گیا۔ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تکلیف دیکھ کر میں نے آئیندہ examiner بننے سے مکمل توبہ کر لی۔ فرمایا: اصلاحی سلسلہ کے تعلق کو کبھی بھی دنیاوی مفاد کے حصول کیلئے استعمال نہ کرنا ورنہ بہت نقصان کا خطرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو غریقِ رحمت فرمائے اور آپ کے فیوضات سے ہمیں محروم نہ فرمائے۔

ملحوظہ: آپ کی سوانحی معلومات جناب عمر فاروق اور ڈاکٹر فہیم الدین نے مہیا کیں۔